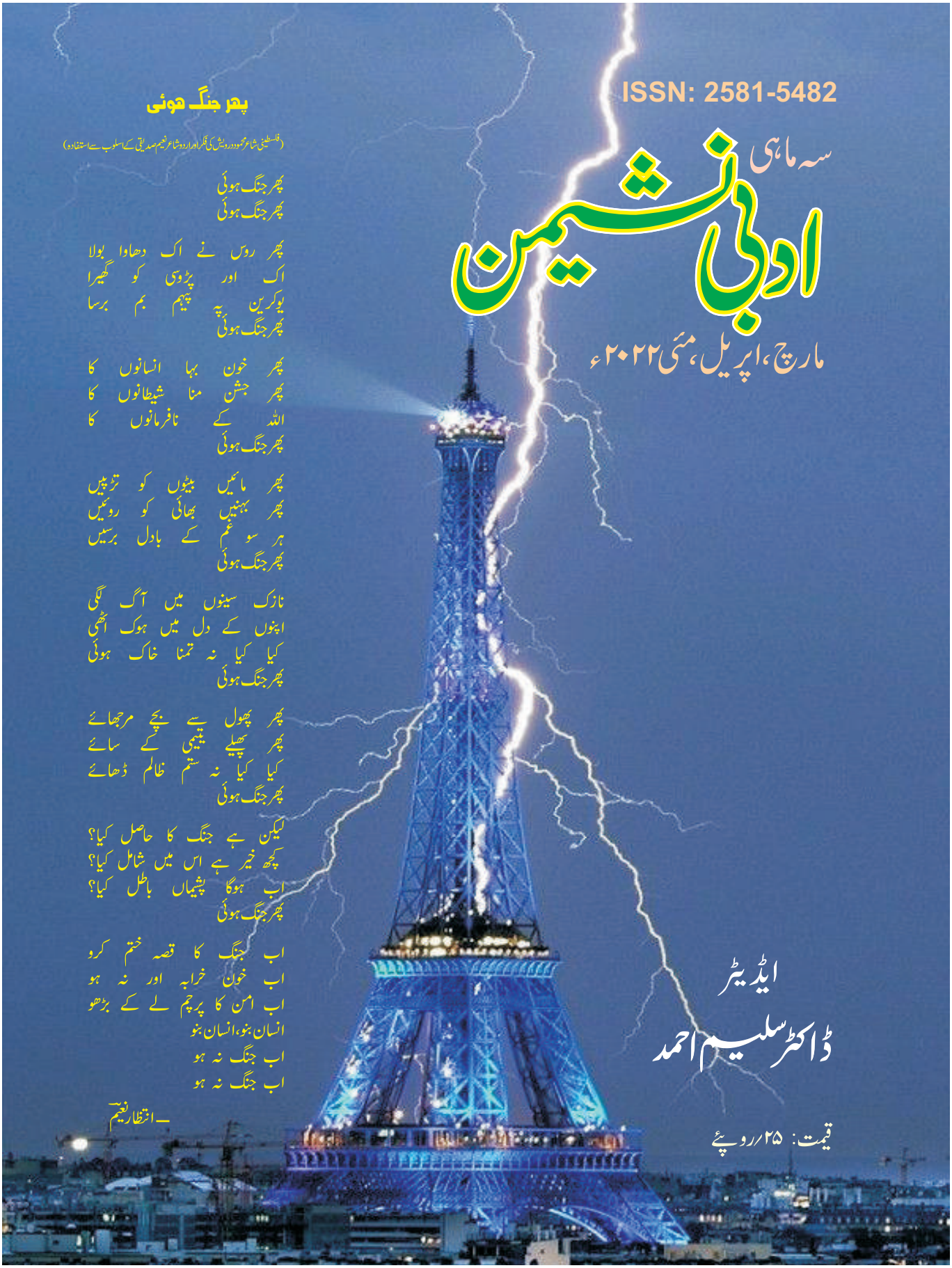
ISSN: 2581-5482

سہ ماہی

ادبی نشیمن

مارچ، اپریل، مئی ۲۰۲۲ء



پھر جنگ ہوئی

(فلسطینی شاعر محمود درویش کی فکر اور اردو شاعر نعیم صدیقی کے اسلوب سے استفادہ)

پھر جنگ ہوئی
پھر جنگ ہوئی

پھر روس نے اک دھاوا بولا
اک اور پڑوسی کو گھیرا
یوکرین پہ پیہم بم برسا
پھر جنگ ہوئی

پھر خون بہا انسانوں کا
پھر جشن منا شیطانوں کا
اللہ کے نافرمانوں کا
پھر جنگ ہوئی

پھر مائیں بیٹوں کو تڑپیں
پھر بہنیں بھائی کو روئیں
ہر سو غم کے بادل برسیں
پھر جنگ ہوئی

نازک سینوں میں آگ لگی
اپنوں کے دل میں ہوک اٹھی
کیا کیا نہ تمنا خاک ہوئی
پھر جنگ ہوئی

پھر پھول سے بچے مرجھائے
پھر پھیلے یتیمی کے سائے
کیا کیا نہ ستم ظالم ڈھائے
پھر جنگ ہوئی

لیکن ہے جنگ کا حاصل کیا؟
کچھ خیر ہے اس میں شامل کیا؟
اب ہوگا پشیماں باطل کیا؟
پھر جنگ ہوئی

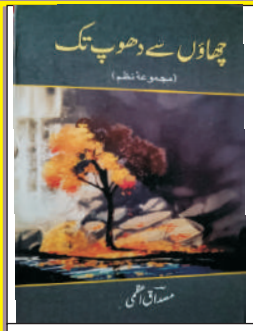
اب جنگ کا قصہ ختم کرو
اب خون خرابہ اور نہ ہو
اب امن کا پرچم لے کے بڑھو
انسان بنو، انسان بنو
اب جنگ نہ ہو
اب جنگ نہ ہو

— انتظار نعیم

ایڈیٹر

ڈاکٹر سلیم احمد

قیمت: ۲۵/روپئے



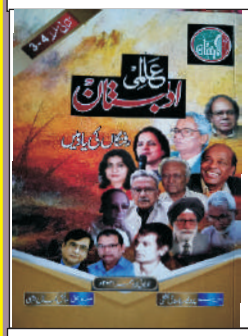
’چھاؤں سے دھوپ تک‘

’’چھاؤں سے دھوپ تک‘‘ عالمی شہرت یافتہ شاعر مصداق اعظمی کی نظموں کا مجموعہ ہے جس میں ایک سو پچاس نظمیں شامل ہیں۔طویل نظموں کے ساتھ ساتھ بہت سی ایسی نظمیں بھی ہیں جو بے حد مختصر ہیں۔اپنے پیش لفظ میں انھوں نے جہاں اپنے تمام احباب کا شکریہ ادا کیا ہے وہیں اپنے حریفوں اور نالاں رہنے والے شعراء کا شکریہ ادا کیا ہے جس سے ان کی اعلیٰ ظرفی کا پتہ چلتا ہے۔تنقید سے ہی تحریک ملتی ہے اور شاعروں کی اسی خفگی سے مصداق کو حوصلہ ملا جس کے نتیجہ میں ان کا یہ پہلا شعری مجموعہ منظر عام پر آیا۔ قیمت ادا کر کے کتاب حاصل کرنے کے لیے 9451431700 پر رابطہ کر سکتے ہیں۔



”صادق دکن دیس میں“

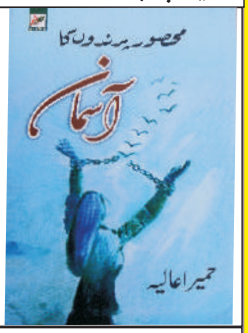
افسانہ ہو یا غزل یا پھر تحقیق وتنقید ڈاکٹر صادق کا نام مشہور ومعروف ہے۔انھوں نے ادب کے مختلف میدانوں میں کافی کام کیا ہے۔قومی کونسل سے شائع ہونے والا رسالہ ’’اردو دنیا‘‘ کی اشاعت میں ان کی کوششیں شامل ہیں۔زیر نظر کتاب میں ڈاکٹر صادق کے قیام دکن سے متعلق نگارشات کو مرتب کیا گیا ہے۔یہ کام اورنگ آباد کے مقبول ومعروف ادیب عبدالقادر صاحب نے انجام دیا ہے اور نام رکھا ہے ’’صادق دکن دیس میں‘‘۔کتاب میں ڈاکٹر صادق کی غزلیں،نظمیں،افسانے اور مضامین شامل ہیں۔



”عالمی ادبستان“

کووڈ۔۱۹ نام کی وبا نے جہاں تمام تر شعبوں کو ٹھپ کر دیا وہیں انسانی اموات کا لامتناہی سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔اس سے اردو ادب کے شعراء،ادبا اور صحافیوں کا طبقہ بھی محفوظ نہیں رہا۔ان میں شمس الرحمٰن فاروقی،پروفیسر ظفر الدین،شمیم حنفی،مظفر حنفی،راحت اندوری، رتن سنگھ،بیگ احساس،مشرف عالم ذوقی،تبسم فاطمہ،ترنم ریاض جیسی ادبی شخصیتیں ایک کے بعد ایک ہم سے رخصت ہوتی گئیں۔

دانش کمال اثری کی ادارت اور پروفیسر فاروق بخشی کی سرپرستی میں ضلع مؤ سے شائع ہونے والا رسالہ ’’عالمی ادبستان‘‘ نے ”رفتگان کی یاد میں“ کے عنوان سے ایسی ہی شخصیتوں کو معنون کیا ہے اپنے کتابی سلسلہ نمبر ۳۔۴ کو، جو ۴۹۶ صفحات پر محیط ہے۔ان شخصیات پر بے حد معلوماتی مضامین اس شمارے میں شامل ہیں۔ریسرچ کے طلبہ کے لیے یہ شمارہ نہایت کارآمد ثابت ہوگا۔



حمیرا عالیہ کا نام معروف نوجوان ادیبوں کی فہرست میں نظر آتا ہے۔موجودہ دور میں صنف افسانہ نگاری میں جو مقام شہر نگاراں کے اس ستارے نے حاصل کیا وہ بھی اتنے کم وقت میں، یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔میں 2017 سے حمیرا عالیہ کی تحریروں کو پڑھتا رہا ہوں۔اور ہمیشہ محسوس کیا کہ حمیرا عالیہ کو تحقیق وتنقید،شاعری میں نظم،افسانہ یا دوسرے اصناف پر دسترس حاصل ہے۔وہ اپنے وجود میں جنم لینے والے احساسوں کو خوبصورت لفظوں کے سانچے میں ڈھالنے کا ہنر رکھتی ہیں۔حال ہی میں 216 صفحات پر مشتمل ان کا پہلا ناول ’محصور پرندوں کا آسمان‘ شائع ہو کر منظر عام پر آیا ہے۔جس کی قیمت صرف 137 روپے ہے۔اس ناول میں انھوں نے جن حساس موضوعات کو پیش کیا ہے،وہ حمیرا عالیہ کی تخلیقی صلاحیت کا مظہر ہے۔میں ان کی اس پہلی تخلیقی کاوش پر دلی کی گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ وہ اس طرح کے مزید کام کرتی رہیں۔کتاب کے حصول کے لیے درج ذیل نمبر پر رابطہ کیا جا سکتا ہے:9250194396 (اویس سنبھلی)



جمیل اختر شفیق نئی نسل کے مقبول شاعر اور کہانی گو ہیں۔انھوں نے بچوں کے لیے لکھی گئی اپنی پہلی کتاب ”روشنی کا سفر“ میں اپنی جن کہانیوں کو شامل کیا ہے،اسے ادبی نقطۂ نظر سے دیکھنے کے بجائے بچوں کی اخلاقی تعمیر کی نظر سے دیکھنا زیادہ مناسب ہوگا۔اور حقیقت یہی ہے کہ آج ادب اطفال کے نام پر جن تحریروں کا وجود عمل میں آرہا ہے،ان میں تعمیر اخلاق کے پہلوؤں سے صرف نظر کر کے اساطیری وغیر منطقی لوازمات کی طرف زیادہ توجہ کی جاتی ہے۔اور اس کی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ بچوں کی دلچسپی کو بنائے رکھنے اور ان کے اندر مطالعے کا شوق پیدا کرنے کے لیے یہ ایک ضروری عمل ہے۔لیکن اس مجموعے میں شامل جمیل اختر شفیق کی 35 کہانیوں میں سے کسی ایک کہانی کو پڑھ کر ایسا نہیں لگتا کہ توجہ کہانی سے ذرا دیر کے لیے بھی ہٹی ہو۔حالانکہ ان کہانیوں میں نہ اساطیر ہے اور نہ ہی کوئی غیر منطقی واقعہ۔بچوں کے اندر دنیا کی آگہی اور دنیا سے جڑے مسائل کا مقابلہ کرنے کے لیے جمیل اختر شفیق کی کہانی کے اسلوب کی پیروی ضروری بھی ہے اور تخریبی اخلاق کے اس دور میں مستحسن بھی۔ دو سو صفحات پر مشتمل اس کتاب کی کی قیمت 170 روپے رکھی گئی ہے جسے درج ذیل نمبر پر کال کر کے طلب کیا جا سکتا ہے: 7004771081

مارچ تا مئی
۲۰۲۲ء
ISSN: 2581-5482
جلد : ۵
شمارہ: ۲

سہ ماہی

ادبی نشیمن

ایڈیٹر
ڈاکٹر سلیم احمد
Mob: 8707260591, 9415693119
saleemahmad110@gmail.com
adbeenasheman@gmail.com

معاون ایڈیٹر
شاہد حبیب
Mob: 8539054888
shahidhabib10@gmail.com

ادبی مشیر
رفعت عزمی
Mob: 9451818310
rafatsafavi@gmail.com

مجلس ادارت

ڈاکٹر غلام حسین (اجین) — ڈاکٹر رضی الرحمٰن (گورکھپور)
ڈاکٹر مجاہد الاسلام (لکھنؤ) — ڈاکٹر اکبر علی بلگرامی
ڈاکٹر شکیل احمد (مئو) — وصی اللہ حسینی (لکھنؤ)

تزئین کار: عبدالسمیع قاسمی (Mob:9335737053)

ادبی نشیمن میں شائع ہونے والے تمام مشمولات میں جن خیالات کا ظہار کیا جاتا ہے اس کی ساری ذمہ داری مصنف کی ہوگی۔ ادارے کا متفق ہونا لازمی نہیں ہے۔

ADABI NASHEMAN

قیمت

فی شمارہ	:	۲۵/روپئے
دوسالہ ممبرشپ مع رجسٹرڈ ڈاک	:	۳۰۰/روپئے
بیرونی ممالک (ہوائی جہاز ڈاک)	:	$15 (امریکی ڈالر)
لائف ٹائم ممبرشپ	:	پانچ ہزار روپئے
لائبریری/ادارہ کے لئے	:	۶۵/روپئے فی شمارہ

ترسیل زر (منی آرڈر) کا پتہ
سہ ماہی ادبی نشیمن
168/C-544 الماس باغ، ہردوئی روڈ، لکھنؤ

Bank Detail

Name : Adbee Nasheman
Bank : Indian Bank, Lucknow
Branch : Balaganj
A/c No : 50489096237
IFSC : IDIB000L558

Address

Editor Urdu Quarterly
ADABI NASHEMAN
544-C/168,Almasbagh
Hardoi Road, Lucknow-03

پرنٹر، پبلشر اور پروپرائٹر احمد رشیق نے نعمانی پرنٹنگ پریس، بارودخانہ، گولہ گنج لکھنؤ سے چھپوا کر 168/544-e، الماس باغ ہردوئی روڈ، لکھنؤ سے شائع کیا۔
ایڈیٹر: ڈاکٹر سلیم احمد

فہرست عنوانات

آغاز

۱ حمد ..... انتظار نعیمؔ ۳
۲ نعت ..... نوشاد اشہرؔ ۳

اداریہ

۳ نظریہ ..... ایڈیٹر ۴

مضامین

۴ علامہ اقبال کے کردار کے چند پہلو ..... ڈاکٹر رؤف خیر ۵
۵ پریم چند: احوال و آثار ..... ڈاکٹر محمد عظمت الحق ۱۰
۶ شمس الرحمٰن فاروقی کی رباعی گوئی: ایک تنقیدی مطالعہ ..... مجتبیٰ حسن صدیقی ۱۷
۷ بشریٰ اعجاز کے افسانوں میں اسلوبیاتی و موضوعاتی کائنا کا مطالعہ ..... ڈاکٹر محمد انور ۲۰
۸ احمد فرازؔ: اردو غزل کا عہد آفریں شاعر ..... خلیق الزماں نصرت ۲۴
۹ خالد جاوید کا ناول 'ایک خنجر پانی میں': مطالعہ کی میز پر ..... غلام علی اخضر ۲۷
۱۰ 'غزل ساز' شاعر: حافظ کرناٹکی ..... ڈاکٹر ریشما قمر ۳۰
۱۱ ولیؔ کی غزلیات میں محبوب کا تصور ..... وقار توحید ۳۴
۱۲ احمرؔ لکھنوی: شخصیت اور شاعری ..... ڈاکٹر صوفیہ محمود ۳۷
۱۳ ڈاکٹر عبدالرشید ظہیری اور ملّا شناسی ..... ڈاکٹر جگدمبا دوبے ۳۹
۱۴ ضیا بارا فراد کے خطوط بنام اصغر عباس: ایک مطالعہ ..... ڈاکٹر شکیل احمد ۴۱
۱۵ دورِ جدید کے چیلنجز اور ادبِ اطفال کی معنویت ..... چراغ ہبلوی ۴۸
۱۶ 'نیتی آیوگ' اور سماج کے استحکام میں اس کا کردار ..... ڈاکٹر عذرا بانو ۵۰

افسانہ

۱۷ گناہ کا خوف ..... چودھری محمد علی ردولوی ۵۲
۱۸ ریپوٹیشن ..... ڈاکٹر قدسیہ بانو ۵۶

غزلیات

۱۹ نعت / غزل ..... شمیم احمد شمیمؔ / رفعت عزمیؔ ۵۷
۲۰ غزلیں ..... ڈاکٹر مقبول احمد مقبولؔ / ڈاکٹر فریاد آزرؔ ۵۸
۲۱ غزلیں ..... موجؔ لکھنوی / ڈاکٹر کہکشاں خاں جلال پوری ۵۹

تبصرے

۲۲ خطوط غالب کے ادبی مباحث ..... از: ڈاکٹر مشیر احمد ..... مبصر: شاہد حبیب ۶۰
۲۳ اجالوں میں سفر: تحریک اسلامی کے ساتھ نصف صدی ..... از: انتظار نعیمؔ ..... مبصر: شاہد حبیب ۶۲

مراسلات ..... قارئین ۶۴

حمدِ باری تعالیٰ

انتظار نعیمؔ (بلیماران، دہلی)

Mob. 9810 841086

رنج وغم ہیں کس کی جانب سے خوشی دیتا ہے کون
موت کس کے ہاتھ میں ہے زندگی دیتا ہے کون

کس کے منشا سے تبسم ریز ہوتی ہے کلی
پھول کو دل لوٹنے والی ہنسی دیتا ہے کون

کون پت جھڑ کو بنا دیتا ہے موجِ رنگ و بو
خشک منظر کو قبائے زندگی دیتا ہے کون

کس نے آہستہ خرامی کی صبا کو دی ادا
بجلیوں کو یہ تڑپ یہ روشنی دیتا ہے کون

آسماں پر کس نے تانی ہے ردائے کہکشاں
کہکشاں کو یوں جمال ودلکشی دیتا ہے کون

چاند کس کے حکم سے آتا ہے پھر بالائے شب
بام و در کو چاندنی ہی چاندنی دیتا ہے کون

کس کے سورج سے منور روز ہوتی ہے سحر
اور دامن بھر کے شب کو تیرگی دیتا ہے کون

کس کی حکمت نے تراشی ہے حدِ صبرو رضا
تنگ دامانی میں بھی آسودگی دیتا ہے کون

میری آنکھوں میں چمک اٹھتا ہے مستقبل نعیمؔ
آنے والے موسموں کی آگہی دیتا ہے کون

***

نعتِ پاک

نوشاد اشہرؔ اعظمی (بلریا گنج، اعظم گڑھ)

Mob:7985535667

پھیلا ہے جب سے مہرِ نبوت کا دائرہ
سمٹا ہوا ہے ماند میں ظلمت کا دائرہ

دنیا میں علم و فہم و فراست کا دائرہ
ضرب المثل ہے آپ کی حکمت کا دائرہ

بھر لوں نگاہ و دل میں زیارت کا دائرہ
یا رب وسیع کر دے بصیرت کا دائرہ

یا رب کرم ہو مجھ پہ مدینہ میں دیکھ لوں
بڑھنے لگا ہے سینے میں حسرت کا دائرہ

پتھر بندھے ہیں شاہِ دوعالم کے پیٹ سے
آنکھوں میں گھومتا ہے قناعت کا دائرہ

جو دیکھ لے بغور سنور جائے زندگی
وہ آئینہ ہے آپ کی سیرت کا دائرہ

یارب دعا ہے گزریں شب و روز اس طرح
پیش نظر ہو آپ کی سنت کا دائرہ

جھوٹے سبھی ہیں دعوے محبت کے آپ سے
گر ہو نہ زندگی میں اطاعت کا دائرہ

بو بکر ہیں عمر ہیں یہ عثمان وہ علی
ضو بار ہے ان ہی سے خلافت کا دائرہ

طاری ہے خوف آج بھی دشمن کے ذہن پر
کھینچا ہے وہ عمر نے شجاعت کا دائرہ

عاجز ہوئے زبان و قلم فکر و فن سبھی
سمٹا نہ ہم سے آپ کی عظمت کا دائرہ

نعت نبی کی بزم ہے آکر تو دیکھئے
ہر سو ہے رنگ و نور کا نکہت کا دائرہ

نقطہ بھی اس امید میں لکھا ہے نعت کا
بن جائے کاش میری شفاعت کا دائرہ

اشہرؔ بیان بخت کا اس کے کروں میں کیا
مل جائے جس کو آپ کی نسبت کا دائرہ

***

اداریہ



اردو کی ترویج میں صرف مشاعروں کا ہی رول نہیں ہوتا بلکہ مشاعروں سے کہیں زیادہ نشستوں کا کردار اہم ہوتا ہے۔ کیوں کہ نشستوں میں وہی لوگ شامل ہوتے ہیں جو شاعری کا ذوق اور شعور رکھتے ہیں۔ اس میں اداکاری کرنے والوں یا پھر تک بندی کرنے والے شاعروں کی بہت کم گنجائش ہوتی ہے۔ ان نشستوں کا انعقاد مختلف کمیٹیوں میں برجستہ، ماہانہ، سہ ماہی یا سالانہ بنیادوں پر ہوتا رہتا ہے۔ جہاں شعراء سامعین سے تالی بجا کر حوصلہ افزائی یا داد کے طالب نہیں ہوتے بلکہ اپنا اپنا جوہر دکھاتے ہیں اور اچھے شعر پر سامعین خود داد وتحسین سے نوازتے ہیں یا پھر صدر مشاعرہ یا استاذ شعراء برمحل اصلاح بھی کردیا کرتے ہیں جس نوآموز شاعر کی زبان و بیان کی کمیاں سوکھے پتوں کو طرح جھڑتی چلی جاتی ہیں اور سامعین تہذیب سے آشنائی حاصل کرتے ہیں۔ مگر افسوس یہ باکمال ادارہ معقول سرپرستی کے نہ ملنے سے کسمپرسی کے دور سے گزر رہا ہے اور کسی کی توجہ اس جانب نہیں جارہی ہے۔ اردو کی ترویج کے نام پر سرکاری اداروں سے بھاری بھرکم رقم لے کر مشاعرہ کمیٹیاں بدعنوانیوں پر تلی ہوئی ہیں۔ یہ بات اب ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ ان مشاعرہ کمیٹیوں میں سرکاری اداروں کا عملہ بھی شامل ہوتا ہے۔ حالانکہ ان سرکاری اداروں کو چاہئے کہ ان ہی مشاعرہ کمیٹیوں کو فنڈ جاری کرے جو باقاعدہ طور پر ماہانہ، سہ ماہی یا سالانہ بنیادوں پر نشستوں کا انعقاد کرتی ہیں یا پھر کم از کم نشستوں کا انعقاد کرنے والی ان کمیٹیوں کے لئے بھی اپنے فنڈ میں سے کچھ رقم مختص کردیں جو اردو کے تحفظ، بقا اور ترویج کے لیے اپنی خدمات پیش کررہی ہیں۔ حالانکہ اب تو اسٹیج شو اور الکٹرانک میڈیا کو بھی اردو کے سرکاری اداروں نے فروغِ اردو کا حصہ ماننا شروع کردیا ہے اور اس پر اچھی خاصی رقم بھی خرچ کردے رہے ہیں تو نشستوں کا انعقاد کرنے والی کمیٹیاں ہی کیوں نظر انداز کی جارہی ہیں۔ سمجھ سے باہر ہے۔ حق تو یہ ہے کہ اسٹیج شو جیسی چیزیں نہ تو اردو کے فروغ کا حصہ ہیں اور نہ ہی اس سے اردو کا کچھ بھلا ہونے والا ہے۔

اسی کے ساتھ یہ عرض کرتا چلوں کہ اردو کی زبوں حالی کے لیے صرف سرکاروں کو موردالزام ٹھہرایا جاتا رہا ہے لیکن کیا کبھی ہم نے اپنا بھی محاسبہ کیا ہے کہ ہم اردو کے لئے کیا کررہے ہیں یا ہم نے اب تک اپنی مادری زبان کے لیے کیا کیا ہے! ہر وہ شخص جو اردو لکھنا پڑھنا جانتا ہو، اسے اپنا احتساب کرنا چاہیے کہ مہینے میں ہم اپنی شناخت کی حامل زبان کے نام پر کتنے پیسے خرچ کرتے ہیں، عملی طور پر اردو کا استعمال کس حد تک کرتے ہیں، یا کرتے بھی ہیں یا نہیں؟ یہ سچ ہے کہ اردو کے سرکاری اداروں میں بھی کبھی انصاف سے کام ہوا کرتا تھا کیوں کہ وہ اردو کے اوقاف (زیر، زبر، نکتہ اور ساکن) سے آشنا تھے، مگر جب سے اردو کے فروغ کے لیے کام کررہے سرکاری اداروں میں سیاسی کارکنان کا عمل دخل ہوا تو یہ ادارے بھی بدعنوانی اور نااہلی کے دلدل میں پھنستے چلے گئے۔ ویسے بھی ریاستوں میں اقلیتی طبقہ سے تعلق رکھنے والے محکموں کے ورک کلچر سے اور ان کی کارکردگیوں سے ہم سبھی واقف ہیں، ایسے میں کسی سے کیا شکایت کریں اور کس سے توقعات وابستہ کریں!

یو جی سی سے منظور شدہ رسائل کی تازہ ترین فہرست جاری ہوئی۔ اسے دیکھ کر آپ تعجب کریں گے کہ اس میں "نیا دور" جیسے رسالے کا نام بھی شامل ہے جو گزشتہ کئی برسوں سے شائع ہی نہیں ہورہا ہے۔ یہ رسالہ حکومتِ اتر پردیش کی طرف سے شائع ہورہا تھا۔ اس کے باوجود اس رسالے کی یہ حالتِ زار! دیکھ کر افسوس ہوتا ہے اور بہت کچھ کہنے کو دل چاہتا ہے۔ لیکن پھر ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو، یہ سوچ کر خاموش ہوجاتا ہوں۔ ممکن ہے یو جی سی کی اس فہرست میں کچھ ایسے اور بھی رسائل شامل ہوں جو "نیا دور" جیسی صورتحال سے دوچار ہیں۔ اب اسے ہم نااہلی تو نہیں کہہ سکتے لیکن گھورلا پروا ہی ضرور کہہ سکتے ہیں۔ یو جی سی کو اس پر غور کرنا چاہئے۔

افسانوی شہرت یافتہ گلوکارہ، بلبل ہند اور بھارت رتن اعزاز یافتہ پُر بہار شخصیت "لتا منگیشکر" (28 ستمبر 1929-6 فروری 2022) کا انتقال ملک کا ایک عظیم ثقافتی خسارہ ہے۔ ان کی آواز کے سحر میں ایک عالم مبتلا تھا۔ لتا کی کمی صدیوں تک محسوس کی جائے گی۔

لکھنؤ اور عالمی ادبی برادری میں یہ خبر افسوس کے ساتھ سنی گئی کہ اردو کے معروف افسانہ نگار، شاعر، ناقد اور ڈرامہ نگار فیاض رفعت (11 نومبر 1940-8 فروری 2022) بھی فانی دنیا کو الوداع کہہ گئے۔ ان کا یوں چلے جانا دیر تک ستائے گا۔ فیاض رفعت عرصۂ دراز تک دوردرشن سے وابستہ رہے۔ "نئے عہد نامے کی سوغات"، "میرے حصے کا زہر"، اور "جہانِ دیگر" (افسانوی مجموعے) "بیتی رتوں کا منظر نامہ" (شاعری) "نقد آگہی"، "اردو افسانے کا پس منظر" (تنقید) اور "زندگی ہے تو کہانی بھی ہوگی" (علی گڑھ کی یادیں) جیسی مقبول کتابیں ان کی یادگار ہیں۔

طویل مدت تک الکٹرانک میڈیا کے ذریعے اپنی بے باک رپورٹنگ سے چونکانے والے کمال خان بھی 14 جنوری 2022 کو ہمیں الوداع کہہ گئے۔ این ڈی ٹی وی جیسے غیر جانبدار چینل کے لکھنؤ بیورو چیف کے طور پر کمال خان نے ایک ایماندار اور حق گو صحافی کی پہچان بنائی تھی۔ ان کے اچانک انتقال سے ایماندارانہ صحافت کی تاریخ کا ایک باب ختم ہوا۔ کمال خاں کا امتیاز یہ تھا کہ وہ شائستہ لب و لہجے میں قصے کی طرح رواں اپنی رپورٹ پیش کرتے اور برمحل اشعار کے استعمال سے ادب کی چاشنی سمو دیتے۔ ایک ایسے وقت میں جب عوام میڈیا کو گودی میڈیا کے نام سے پکارنے لگی ہے، کمال خاں کا غیر متوقع طور پر خاموش ہوجانا، اپنے پرائے سبھی کو سوگوار کرگیا۔ ادبی نشیمن کنبہ ان سبھی شخصیتوں کے اہلِ خانہ سے تعزیت پیش کرتا ہے۔

ادبی نشیمن کے اس شمارے میں چند اہم مضامین کے ساتھ ساتھ ایک نئے تجربے کی شروعات کی جارہی ہے، آپ کو ہماری یہ کاوش اور یہ تجربہ کیسا لگا، اپنی رائے سے ضرور آگاہ کیجئے گا۔ شکریہ

ڈاکٹر سلیم احمد

علامہ اقبال کے کردار کے چند پہلو

ڈاکٹر رؤف خیر

(موتی محل گولکنڈہ۔حیدرآباد Mob: 9440945645)

یہ ایسا موضوع ہے جس پر بہت کچھ کہا جاسکتا ہے۔اسی لیے یہاں اقبال کے کردار کے چند پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی جارہی ہے۔''خدوخال اقبال'' سے چند واقعات پیش کیے جارہے ہیں۔امین زبیری نے ان واقعات کو بیان کرکے ان پر شدید ریمارکس بھی کیے ہیں۔یہ بات طے ہے کہ علامہ اقبال کو قرآن وسنت سے بے انتہا شغف رہا ہے۔تلاوتِ کلام پاک کے دوران وہ خوب رویا بھی کرتے تھے۔اللہ کے کلام کو سمجھ کر پڑھنے والے پر کچھ نہ کچھ اثرات کا مرتب ہونا ضروری ہے۔خود قرآن بھی تو یہی مطالبہ کرتے ہوئے جگہ جگہ پوچھتا ہے افلا تعقلون ! افلا تدبرون. یہ کوئی ناول یا افسانہ نہیں۔لوگ تو دردانگیز ناول پڑھ کر ہی رویا کرتے تھے۔ایک ناول نگار راشد الخیری تو ''مصورِ غم'' کے القاب سے ملقب تھے۔اللہ کے کلام میں بھی بے شمار عبرت خیز واقعات درج ہیں۔اللہ نے یہاں تک کہہ دیا کہ یہ کتاب ایسی ہے جس میں تمہارا ہی ذکر ہے۔اقبال کو قرآن سے گہرا دلی لگاؤ تھا۔یہی سبب رسول اللہ سے تعلق خاطر کا تھا۔صاحبِ ''خدوخالِ اقبال'' نے ایک واقعہ درج کیا ہے جس سے اقبال کے کردار پر روشنی پڑتی ہے۔

''پنجاب کے ایک دولت مند رئیس نے ایک قانونی مشورے کے لیے اقبال اور سر فضل حسین اور دو ایک مشہور قانون داں اصحاب کو اپنے ہاں بلایا اور اپنی کوٹھی میں ان کے قیام کا انتظام کیا۔رات کو اقبال جس وقت اپنے کمرے میں آرام کرنے کے لیے گئے تو ہر طرف عیش وتنعم کے سامان دیکھ کر اور اپنے نیچے نہایت نرم اور قیمتی بستر پا کر معاً ان کے دل میں یہ خیال آیا کہ جس رسول پاک کی جوتیوں کے صدقے میں آج ہم کو یہ مرتبے نصیب ہوئے ہیں، اس نے بوریے پر سوسو کر زندگی گزاری تھی۔یہ خیال آنا تھا کہ آنسوؤں کی جھڑی بندھ گئی۔اس بستر پر لیٹنا ان کے لیے ناممکن ہوگیا۔اٹھے اور برابر غسل خانے میں جا کر ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور مسلسل رونا شروع کردیا۔جب ذرا دل کو قرار آیا تو اپنے ملازم کو بلا کر اپنا بستر کھلوایا اور ایک چارپائی اس غسل خانے میں بچھوائی اور جب تک وہاں مقیم رہے غسل خانے ہی میں سوتے رہے۔(بحوالہ طاہر فاروقی-سیرت اقبال ص:۸۲)

اس واقعے پر امین زبیری طنز کرتے ہیں کہ اتنے بڑے غسل خانے کہاں ہوتے ہیں جن میں چارپائی بھی بچھائی جاسکے اور پھر غسل خانے میں سونا صحت کے لیے بھی مضر ہے۔علامہ (اقبال) چونکہ نماز تہجد و پنجگانہ وتلاوت کلام پاک کے پابند بھی تھے نفیس مزاج بھی تھے۔یہ واقعہ صحیح نہیں لگتا۔(حیدرآباد کے نوابی خاندان کے فرد ڈاکٹر حسن الدین احمد کا غسل خانہ دیکھا ہے جس میں ایک تو کیا تین چار چارپائیاں آسکتی ہیں۔خیر)

نفس مضمون دراصل یہ ہے کہ اقبال نے نرم بستر پر سونا گوارہ نہیں کیا۔غسل خانے میں نہ سہی غسل خانے کے قریب اپنی چارپائی ڈلوالی ہوگی۔اصل بات یہ ہے کہ اقبال کو حضور اکرم کی بوریہ نشینی یاد آگئی تھی۔اس واقعے کو رد کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

''خدوخالِ اقبال'' میں ایک اور واقعہ محمد طاہر فاروقی کی کتاب ''سیرتِ اقبال'' سے درج کیا گیا ہے:

ایک دفعہ سر اکبر حیدری صدر اعظم حیدرآباد نے آپ کو توشہ خانے سے ایک ہزار روپئے کا چیک بھیجا۔چوں کہ یہ دوستانہ تحفہ نہ تھا بلکہ روپیہ ایک ایسے فنڈ سے بھیجا گیا تھا جس کا لینا علامہ کی غیرت کسی طرح گوارا نہ کرسکتی تھی اس لیے آپ نے چیک واپس کردیا اور یہ اشعار لکھ بھیجے۔

تھا یہ فرمان الٰہی کہ شکوہ پرویز — دو قلندر کو کہ ہیں اس میں ملوکانہ صفات
مجھ سے فرمایا کہ لے اور شہنشاہی کر — حسن تدبیر سے دے آنی وفانی کو ثبات

غیرتِ فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات

یہاں امین زبیری اقبال کے کردار کو سراہنے کے بجائے فرماتے ہیں کہ اقبال کے سر اکبر حیدری اور ان کے خاندان سے اچھے روابط تھے۔ ۱۹۱۰ء میں جب علامہ اقبال حیدرآباد گئے تھے تو اس خاندان نے ان کی پذیرائی کی تھی اور گنبدان شاہی دکھائے تھے۔ اس سفر کی یادگار اقبال کی دلکش نظم ''گورستانِ شاہی'' ہے۔ اس کے باوجود ایک ہزار روپئے کا چیک لوٹانے والی بات سمجھ میں نہیں آتی جب کہ اقبال بھوپال وغیرہ کے سربراہان مملکت سے استفادہ کرتے ہی رہتے تھے۔

علامہ اقبال کو اس امدادی مد سے پیسہ قبول نہ تھا جس کے ذریعے محتاجوں کی مدد کی جاتی تھی۔ یہ دراصل دفتری غلطی تھی اسی لیے اقبال نے وہ رقم قبول کرنا گوارا نہ کی۔ اگر آج بھی کسی دوست کی اگر کوئی یہ کہہ کر مدد کرے کہ یہ رقم بینک کے سود یا زکوٰۃ کی مد سے ہے تو میرا خیال ہے وہ بھی اسے قبول کرنے میں تامل کرے گا۔

''خدوخال اقبال'' ہی سے اقبال کے کردار کا ایک اور پہلو بھی اجاگر ہوتا ہے:

''اقبال کے عقیدت مندوں اور معترفوں نے اقبال ڈے کے موقع پر قوم کی جانب سے اقبال کی بارگاہ میں اپنی عقیدت مندی کا ایک مادی ثبوت پیش کرنے کے لیے ایک لاکھ (روپئے) کا کیسۂ زرنذر کرنے کی تجویز پیش کی۔ اس تحریک نے برق رفتاری کے ساتھ کامیابی حاصل کی۔ اقبال کو جب اس تجویز کی اطلاع پہنچی تو انہوں نے اس کے بانیوں کو لکھا کہ شاعر، انسانیت کے درد کی دوا اسی وقت بن سکتا ہے جب کہ انسانیت کے درد کا شریک اور مشاکل حیات اور زندگی کی کشمکشوں سے اپنے بل بوتے پر نپٹنے اور ان کو اپنے زور بازو سے حل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ عیش و تنعم کی زندگی شاعر کو الہام سے محروم کر دیتی ہے۔ وہ پھر انسانیت کے کسی درد کی دوا نہیں بن سکتا۔ آج اگر اقبال آپ کی نظر میں انسانیت کی کوئی خدمت کر رہا ہے تو یہ محض اس وجہ سے کہ وہ ان کے آلام میں خود شریک ہے۔ تو کیا یہ کیسۂ زر پیش کر کے قوم کو اقبال سے محروم کر دینا چاہتے ہو۔ اس طرح اقبال نے اس تحفۂ زر کے لینے سے انکار کر دیا اور معطیوں کو ان کے عطیے واپس کر دیے گئے۔''

حالانکہ اقبال بعض امراض کا شکار تھے۔ تنگ دستی کی زندگی گزار رہے تھے۔ ان کی وکالت ٹھپ تھی۔ کوئی ذریعہ روزگار نہیں تھا۔ یہ اقبال کے کردار کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے کہ ضرورت مند ہونے کے باوجود انہوں نے اقبال ڈے منانے والوں کو فنڈ اکٹھا کر کے اقبال کی خدمت میں ایک لاکھ روپئے کا کیسۂ زر پیش کرنے سے روک دیا۔ انہوں نے دریا کے بلبلوں سے سبق سیکھا:

چوں حباب از غیرتِ مردانہ باش
ہم بہ بحر اندر نگوں پیمانہ باش

سمندر کی سطح پر ابھرتے ہوئے بھی بلبلہ اپنا پیمانہ الٹا رکھتا ہے کہ مردانہ غیرت کا تقاضہ یہی ہے۔ سمندر میں بھی رہتے ہوئے پیمانہ کو منت پذیر نہیں ہونے دینا چاہیے۔ علالت اور اسی کسمپرسی کے زمانے میں نواب صاحب بھوپال نے دیرینہ تعلقات کے تحت اپنی جیب خاص سے ماہانہ پانچ سو روپیہ دینا چاہا مگر اقبال نے قبول کرنا گوارا نہیں کیا۔ یہ اطلاع بھی ''خدوخال اقبال'' ہی سے بحوالہ ''سیاسی کارنامہ'' ملتی ہے۔ بھوپال سے دیگر وظائف کا ذکر کر کے مصنف اقبال پر سوال بھی کھڑے کرتے ہیں۔

(سر راس مسعود کے نام خطوط سے واضح ہو چکا ہے کہ اقبال حاکمِ بھوپال سے ماہانہ پانچ سو روپے کے لئے اصرار کرتے رہے ہیں جو منظور کیے گئے۔ اقبال نامے۔2006)

نواب حمید اللہ خان صاحب سے ماہانہ پانچ سو روپے کی پنشن پانے کے دوران ہز ہائی نس آغا خان صاحب سے بھی ماہانہ وظیفے کی صورت پیدا ہوئی تھی مگر اقبال نے انکار کر دیا تھا۔ ثبوت میں اقبال کے خط کا اقتباس پیش ہے:

لاہور، ۱۸ ستمبر ۱۹۳۵ء

ڈیئر مسعود

اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال کی پنشن قبول کرنے کے بعد کسی اور طرف نگاہ کرنا آئینِ جواں مردی نہیں ہے...''۔ (اقبال نامے۔ مرتبہ ڈاکٹر اخلاق اثر)

علامہ اقبال کے کردار کا ایک پہلو یہ بھی ''خدوخال اقبال'' ہی کے حوالے سے مترشح ہوتا ہے کہ برطانیہ حکومت کے دور میں:

ایک مرتبہ حکومت ہند نے ان کو جنوبی افریقہ میں اپنا ایجنٹ (غالباً سفیر) بنا کر بھیجنا چاہا اور یہ عہدہ ان کے سامنے باقاعدہ پیش کیا مگر شرط یہ تھی کہ وہ اپنی بی بی کو پردہ نہ کرائیں گے اور سرکاری تقریبات میں لیڈی اقبال کو ساتھ لے کر شریک ہوا کریں گے۔ اقبال نے اس شرط کے ساتھ یہ عہدہ قبول کرنے سے انکار کر دیا اور خود لارڈ ولنگٹن (وائسرائے وقت) سے کہا کہ ''میں بے شک ایک گناہ گار آدمی ہوں۔ احکام اسلامی کی پابندی میں بہت کوتاہیاں مجھ سے ہوئی ہیں مگر اتنی ذلت اختیار نہیں کر سکتا کہ محض آپ کا ایک عہدہ حاصل کرنے کے لئے شریعت کا حکم توڑ دوں!''

(بحوالہ سیاسی کارنامہ صفحہ ۳۲۲)

امین زبیری اس پر بھی معترض ہیں کہ تحریری طور پر اس قسم کے احکامات باقاعدہ طور پر کب نکلے۔ اقبال نے اگر باقاعدہ ہی جواب دیا تھا وہ تحریر کہاں ہے؟ یہ پیشکش وائسرے ولنگٹن کے دور میں ہوئی تو گویا ۱۹۳۱ء کے دورانیے میں ہوئی۔ اس زمانے میں تو اقبال بیمار تھے اور بیمار کو ایسی پیشکش کا امکان کم ہے۔ امین زبیری امکانات کی روشنی میں خوش گمانی سے بھی تو کام لے سکتے تھے۔ بدگمانی ہی کیا ضروری ہے۔

''خدوخال اقبال'' میں ''ذکر اقبال'' کے مصنف کے حوالے سے امین زبیری نے علامہ اقبال کے نائٹ ہڈ (سر) کے خطاب پر بھی بحث کی

ہے۔نواب سر ذوالفقار علی کے اس وقت کے گورنر میکلاگن سے گہرے تعلقات تھے۔ انہوں نے گورنر سے ٹیگور کی طرح اقبال کے لیے بھی نائٹ ہڈ (سر) کے خطاب کی گزارش کی۔ انہوں نے گورنمنٹ ہاؤس میں اقبال کو مدعو کیا تھا کہ وہ ایک انگریز صحافی سے انہیں ملانا چاہتے تھے جو ''اسرارِ خودی'' کا انگریزی ترجمہ پڑھ کر اقبال سے ملاقات کا متمنی تھا۔ وہیں گورنر نے اقبال کے لیے سر کے خطاب کی سفارش کرنے کا عندیہ ظاہر کیا۔ اقبال کی ہامی سے وہ خوش ہوا۔ یوں اقبال ''سر'' ہوگئے۔ اس پر بھی امین زبیری فرماتے ہیں کہ یہ اعزاز کوئی انوکھی بات نہیں بلکہ اصل یہ ہے کہ حکومت اہل علم وفضل کو بھی ایسے اعلیٰ خطاب سے نوازتی تھی اور اب تک جن کو سر کا خطاب ملا تھا اُن میں کسی مسلمان کا نام نہیں تھا۔ علامہ اپنی تصانیف و شاعری کی وجہ سے یورپ میں بھی مشہور تھے۔

''خدو خال اقبال'' میں امین زبیری نے ''ذکر اقبال'' کے حوالے سے نواب سر ذوالفقار علی خان کی ایماء پر اقبال کے لیے بھی سر کے خطاب کی گزارش کی جو روداد سنائی اس کا اہم مسلمان کردار ہی سر ذوالفقار علی خان تھے۔ گویا اقبال سے پہلے بھی سر کا خطاب پانے والے مسلمان موجود تھے جیسے سر سید احمد خان۔

سر کے اس خطاب کے بعد علامہ اقبال اپنے ایک خط مورخہ ۱۳ جنوری ۱۹۲۳ء میں رقم طراز ہیں: جس سے اقبال کے کردار کا ایک اور مضبوط پہلو سامنے آتا ہے:

''یہ اسرار خودی'' کا انگریزی ترجمہ ہونے اور اس پر یورپ اور امریکہ میں متعدد ریویو چھپنے کا نتیجہ ہے۔ دنیوی نقطۂ نگاہ سے یہ ایک قسم کی عزت ہے مگر ہر عزت فقط اللہ کے لیے ہے''۔ (''سورۂ منافقون'' کی طرف اقبال کا اشارہ ہے کہ عزت تو اللہ اور رسول اللہ کے لیے ہی ہے منافقین کے لیے ہرگز نہیں)

اسے بھی ہم اقبال کے کردار کا ایک مثبت پہلو ہی لیں گے کہ علامہ اقبال نے راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے خرچ پر یروشلم جانے کے باوجود موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حرم نبوی پر حاضری نہیں دی جس کی صراحت علامہ ہی کی زبانی سنئے:

''مدینۃ النبی کی زیارت کا قصد تھا مگر میرے دل میں یہ خیال جاں گزیں ہوگیا کہ دنیوی مقاصد کے سفر کرنے کے ضمن میں حرم نبوی کی زیارت کی جرأت کرنا سوئے ادب ہے۔ اس کے علاوہ بعض مقامی احباب سے وعدہ تھا کہ جب حرم نبوی کی زیارت کے لئے جاؤں گا تو وہ میرے ہم عناں ہوں گے۔ ان دو خیالوں نے مجھے باز رکھا ورنہ کچھ مشکل نہ تھا۔''

ویسے یہ عذر لنگ لگتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے کرم سے انڈین ایمبسی ریاض جب کبھی مشاعرے کرتی ہے تو مدعو شاعروں کو عمرہ کرواتی ہے اور مدینہ لے جا کر حرم نبوی کی زیارت سے بھی مشرف کرتی ہے۔ دوبار مجھ ناچیز روٗف خیر کو بھی انڈین ایمبسی نے ریاض اور جدہ کے مشاعروں میں مدعو کیا اور دونوں بار الحمدللہ عمرے کی سعادت اور مسجد نبوی میں عبادت کے ساتھ روضۂ اقدس کی زیارت بھی نصیب ہوئی۔ اب اگر کوئی شاعر یہ کہہ کر اس سعادت سے محروم ہونا چاہے کہ وہ تو صرف مشاعرے ہی پڑھے گا تو گویا وہ اک نعمتِ غیر مترقبہ سے ہاتھ دھو رہا ہے۔

اقبال کے حرم نبوی نہ جانے پر امین زبیری طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مدینے کی حاضری کی بڑی آرزو کرنے والے اقبال پچیس تیس ہزار روپئے خرچ کر کے اپنے گھر جاوید منزل کی تعمیر کرتے ہیں اور اپنی تمام جمع پونجی سے افغانستان کے نادر شاہ کی امداد کرتے ہیں مگر حرمین کے سفر کی توفیق انھیں نہیں ہوتی۔ ہم کسی کے دل کا حال نہیں جانتے، ویسے اللہ کی مرضی جسے جو سعادت بخشنا چاہتا ہے وہی سرفراز ہوتا ہے۔ کئی ایسے لوگ ہیں جو حج و زیارت حرمین کے باوجود شرکیہ عقائد و بدعات میں مبتلا رہتے ہیں۔

علامہ اقبال کے ایک اور کردار کا پہلو ''خدو خال اقبال'' ہی سے ابھرتا ہے کہ ۱۵/اپریل ۱۹۱۷ء کو مہاراجہ کشن پرشاد شاد کے نام ایک خط میں اپنی خصوصیات، تعلیمی قابلیت اور تدریسی و تصنیفی خدمات کی تفصیل بھیجی تاکہ ہائی کورٹ کی ججی کے منصب کے لیے ان کی پرزور و مدلل سفارش مہاراجہ کرسکیں۔ ویسے علامہ اقبال نے انگریزی میں ایک کتاب RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM ضرور لکھی جس کے بارے میں ان کے قریب ترین دوست سید سلیمان ندوی نے کہا کہ کاش اقبال نے یہ کتاب نہیں لکھی ہوتی۔ مذکورہ انگریزی کتاب اسلام کے بنیادی عقائد سے ٹکراتی ہے۔ اس مشکل کتاب کا نذیر نیازی نے مزید مشکل اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ آسان زبان میں اگر یہ ہوتی تو خواص کے ساتھ ساتھ عوام بھی اقبال سے بدظن ہوجاتے۔ جہاں تک حافظ شیرازی کے فکر وفن کی بات ہے اقبال نے صاف صاف کہہ دیا تھا:

ہوشیار از حافظ صہبا گسار
جامش از زہر اجل سرمایہ دار
محفل اور درخورِ ابرار نیست
ساغر او درخورِ احرار نیست

علامہ اقبال حافظ شیرازی سے تو قوم وملت سے دور رہنے کی تلقین کرتے ہوئے اس کے خلاف چونتیس اشعار کا ایک قطعہ بند ہی لکھا تھا کہ اس کی شاعری بے عملی کی ترغیب دیتی ہے۔ خود اقبال کی صورت حال بھی کچھ مختلف نہیں تھی۔ ''سیرت اقبال'' کے خدوخال ملاحظہ فرمائیے:

''ایک بار بلوچیوں کا ایک وفد علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ وفد کے ایک ممبر نے (اقبال سے) کہا آپ کی تعلیمات نے مدت کی سوئی ہوئی قوم کو بیدار کر دیا اور آپ نے انسانیت اور اسلام کے تمام اسرار و رموز ہم کو سکھا دیے لیکن ہمیں شکایت ہے کہ آپ نے خود نمونہ عمل پیش نہیں کیا۔ سر محمد اقبال نے جواب میں فرمایا:

''کیا یہ میرا عمل کافی نہیں ہے کہ میں نے قوم کو بیدار کر دیا اور تمہارے سامنے عمل کی شاہ راہ پیش کر

دی۔ میرا کام ہے درس دینا۔ آگے یہ تمہارا ذمہ ہے کہ ان تعلیمات پر عمل کرو اور میدانِ زندگی میں جہاد کرتے رہو۔'' انہوں نے مزید اعتراف کیا کہ ''دنیا میں صرف ایک ہی ہستی گرامی ہے کہ جس نے ایک درس اور پیغام پیش کیا اور پھر خود ہی اس پر عمل کر کے بھی دکھایا۔ وہ شخصیت وہ ذات محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی یا پھر مثال میں موسیٰ کا نام لیا جاتا ہے۔''

(خدوخال اقبال-امین زبیری بحوالہ سیرتِ اقبال صفحہ ۱۱۷)

ایسے ہی شاعروں کے لیے قرآن نے کہا **یقولون ما لا یفعلون** ۔ یہ ایسے لوگ ہیں جو وہ کہتے ہیں جس پر عمل نہیں کرتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ باعمل شخصیات رہے ہیں۔ امام ابن تیمیہؒ بے شمار کتابوں کے ذریعے نہ صرف قلم سے جہاد کرتے رہے بلکہ باضابطہ تلوار کے ذریعے بھی میدان کارزار میں حصہ لیتے رہے۔ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی وہ واحد ذات ہے جس نے قلم اور تلوار کے ذریعہ جہاد میں عملاً حصہ لیا مگر اپنے پیچھے کوئی فرقہ نہیں چھوڑا۔ اپنی بے عملی کے دفاع میں مولوی محمد علی کو اقبال نے جواب دیا تھا کہ ''میں اپنی پیش کردہ تعلیمات پر عمل بھی کرتا تو شاعر نہ ہوتا بلکہ مہدی ہوتا۔'' ایک اور بھی جواب دلچسپ دیا کہ قوال کی دھن پر سب وجد میں آتے ہیں ناچتے گاتے ہیں مگر قوال کو وجد نہیں آتا۔ حافظ شیرازی سے قوم کو ہوشیار رکھنے والے اقبال اپنی دوست عطیہ فیضی سے فرماتے ہیں:

''جب میرا ذوق جوش پر آتا ہے تو حافظ کی روح مجھ میں حلول کر جاتی ہے اور میں خود حافظ بن جاتا ہوں۔''

اقبال کے کردار کا یہ بھی عجیب وغریب پہلو ہے کہ جس حافظ شیرازی کا رد کرتے رہے بالآخر اسی میں ڈھل گئے۔

اقبال کے کردار کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ سات اپریل ۱۹۱۰ء کے اپنے خط میں عطیہ فیضی سے فرماتے ہیں:

براہ کرم میری سیاحت حیدرآباد سے متعلق کوئی سے حسب دل خواہ نتائج اخذ نہ کیجئے۔ مثلاً یہ کہ اعلیٰ حضرت حضور نظام میری قدر افزائی فرما رہے ہیں۔ اس معاملے میں خود میری تحریر کا انتظار فرمایئے..... میں نے کب اعلیٰ حضرت حضور نظام کی طرف سے اپنی قدر افزائی کو اپنے لیے سرمایۂ افتخار سمجھا ہے۔ آپ کو تو معلوم ہے مجھے ان باتوں کی مطلق پروا نہیں اگرچہ لوگ بدقسمتی سے مجھے بہ حیثیت شاعر ہی کے جانتے ہیں لیکن میں شاعر کی حیثیت سے شہرت کا آرزومند نہیں ہوں۔

ابھی چند روز ہوئے مجھے نیپلز سے ایک اطالوی رئیسہ کا خط آیا تھا جس میں اس نے میری چند نظمیں مع انگریزی ترجمے کے طلب کی تھیں لیکن شاعری کے لیے میرے دل میں کوئی ولولہ موجود نہیں اور اس کی ذمہ داری آپ پر عائد ہوتی ہے۔ جب مجھے ممالک غیر سے ایسے شائستہ اشخاص کی قدر دانی میسر آئے تو مجھے ایک ہندوستانی والیِ ریاست کی قدردانی کی کیا پرواہو سکتی ہے۔''

پھر یہی اقبال اپنا BIO DATA مہاراجہ کشن پرشاد کو بھیج کر ہائی کورٹ ججی کے لیے حضور نظام سے سفارش کی گزارش کرتے بھی دکھائی دیتے ہیں۔

۱۹۱۴ء میں ''اسرار خودی'' کو ایک تمہیدی نظم کے ساتھ سر سید علی امام کے نام معنون کیا جو اس زمانے میں گورنر جنرل کی ایگزیکٹیو کونسل میں لا ممبر تھے اور حیدرآباد کی وزارت عظمیٰ پر مقرر ہونے والے تھے۔ اس گران مایہ کتاب اور موصوف میں کوئی مناسبت ہی نہیں تھی البتہ اقبال کو حیدرآباد ہائی کورٹ کی ججی کی امید ہو گئی تھی۔ اس نظم کا تمہیدی اور آخری شعر کچھ یوں ہیں:

اے امام سید و الانسب
سلطنت را دیدہ افروز آمدی
نذرِ اشکِ بے قرار از من پذیر
گریۂ بے اختیار از من پذیر

مگر ''اسرار خودی'' کی اگلی اشاعت میں یہ اشعار حذف کر دئے گئے۔ ججی کی امید میں سر علی امام کی حیدرآباد آمد کی اطلاع جب کشن پرشاد شاد نے اقبال کو دی تو (علامتی انداز میں) اقبال شاد کو لکھتے ہیں ''سرکار ظہور امام کی خبر دیتے ہیں۔ پھر کیا عجب کہ اقبال کی دیرینہ ارادت اور خماری شاد کی کشش متحد ہو کر کام کر جائیں۔

(خط بہ نام شاد مورخہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۱۹ء)

اقبال نے ہائی کورٹ ججی کی آرزو میں یہ سب کارروائیاں کیں تو کچھ غلط نہیں کیا مگر حضور نظام سے بے نیازی دکھانے کا ڈھونگ رچانے کی ضرورت نہیں تھی۔ ''ہندوستانی والیِ ریاست کی قدردانی کی کیا پرواہو سکتی ہے'' کہنا بے معنی ہو جاتا ہے۔ اس مرحلے پر حضور نظام سابع کی شان میں اقبال کے لکھے مدحیہ اشعار بھی ان کے رموز بے خودی کا حصہ بن کر ابھرتے ہیں۔ جہاں وہ قصیدہ گو شاعروں کی طرح نظام سابع کو آسمان پر چڑھاتے دکھائی دیتے ہیں۔

اے مقامت برتر از چرخ بریں
از تو باقی سطوتِ دین
بیں جلوۂ صدیق از سیمائے تو
حافظ ما تیغ جوشن خائے تو
از تو مارا صبح خنداں شامِ ہند
آستانت مرکز اسلام ہند
دوشِ ملت زندہ از امروز تو
تابِ ایں برق کہن از سوز تو
بندگاستیم ما تو خواجہ
از پئے فردائے ما دیباچہ
گوہرم را شوخی اش بیباک کرد
تا گریبان صدف را چاک کرد
پیش سلطاں ایں گہر آوردہ ام
قطرۂ خونِ جگر آوردۂ ام

اقبال حضور نظام سابع کی تعریف میں اسی طرح غلو سے کام لیتے نظر آتے ہیں، جس طرح عام درباری شاعر دیگر بادشاہوں کو خوش کر کے اپنا الوسیدھا کیا کرتے رہے ہیں۔

اقبال کہتے ہیں کہ اے بادشاہ تیرا مقام تو آسمان سے بھی زیادہ بلند ہے اور تیری وجہ سے دین مبین کی شان وشوکت قائم ہے۔ تیری پیشانی میں

صدیق اکبر کی جھلک دکھائی دیتی ہے اور تیری تلوار وزرہ ہماری محافظ ہے۔ ہند کی شام تیری وجہ سے ہمارے لیے خوش گوار صبح کی طرح ہے کیوں کہ تیرا آستانہ اسلام کا مرکز ہے۔ تیرے آج سے ملت کا کل سلامت ہے کہ اسلامی وملی برق کہن کی تاب تیرے سوز سے قائم ہے۔ ہم سب تیرے غلام ہیں اور تو ہمارا سردار ہے۔ ہمارے مستقبل کا عنوان تو ہے میرا جوہر تیری بے باکی کا مرہون منت ہے جس طرح صدف کو چاک کر کے موتی برآمد ہوتا ہے، میں نے اپنا موتی اپنا کمال تیری خدمت میں پیش کر دیا ہے۔ یہی میرا قطرۂ خونِ جگر ہے۔

(دروغ برگردنِ راوی) اس موقع پر جوش ملیح آبادی سے منسوب بے باکی کی ایک روایت یاد آتی ہے کہ میر عثمان علی خان نظامِ سابع نے اپنی ایک غزل کے مقطع میں کہا تھا:

سلاطین سلف سب ہو گئے نذرِ اجل عثماں
مسلمانوں کا تیری سلطنت سے ہے نشاں باقی

جوشؔ نے دوسرے مصرعے میں صرف ایک لفظ کی تبدیلی کی۔ ''مسلمانوں سے تیری سلطنت کا ہے نشاں باقی'' جس کی پاداش میں انھیں ملک بدر کر دیا گیا تھا۔

واللہ اعلم بالصواب۔ اقبال کے کردار کے یہ چند اچھے برے پہلو پیش کئے گئے ہیں کہ انسان بہ ہر حال خطاء ونسیان وخواہشات کا پیکر ہے۔

پس نوشت:

محفلِ اقبال شناسی حیدرآباد میں تقریباً پچیس لکچرس میں نے علامہ اقبال سے متعلق دیے جو یوٹیوب پر ملاحظہ فرمائے جا سکتے ہیں۔ اور ویب سائٹ www.mahafil-e-aliya.com پر بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ میرا ایسا ہی ایک لکچر ''اقبال کے کردار کے چند پہلو'' دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ لکچر جب میں نے اپ نے کرما محترم ڈاکٹر کمار پانی پاتی کی خدمت میں واٹس آپ پر بھیجا تو انھوں نے فرمایا کہ اقبال کے کردار کا ایک اور پہلو بھی ہے جو سید مظفر حسین برنی کی کتاب Iqbal poet patriot of India میں صفحہ 114 پر درج ہے۔ میرے چھوٹے بیٹے ہاتھ خیری نے rekhta.com پر وہ کتاب ڈھونڈ نکالی۔ تقریباً نوّے سالہ ڈاکٹر کمار پانی پتی کے حافظے کی داد دینی پڑے گی کہ کتاب کے صفحہ 114 پر ہی پورا واقع درج ہے جو علامہ اقبال کی اعلیٰ ظرفی کی مثال ہے۔ محترم مظفر حسین برنی نے جہاں علامہ اقبال کے کئی مکتوبات کو جمع و مرتب کیا ہے وہیں انگریزی میں بھی'' Iqbal poet patriot of India ''1987 میں پیش کی تا کہ تنگ نظر متعصب ذہنوں پر اقبال کی غیر متعصب شخصیت واضح ہو جائے۔ جناب مظفر حسین برنی ہریانہ کے گورنر تھے۔ انھوں نے مذکورہ کتاب ملک کی وزیر اعظم اندرا گاندھی کے نام معنون کی جن کا 31 اکٹوبر 1984 کو قتل کیا گیا تھا جس کے بعد ہندو سکھ فسادات پھیل گئے تھے۔ (وکاس پبلشنگ ہاؤس، انصاری مارکٹ نئی دہلی 110002 نے مذکورہ کتاب یکم مارچ 1987 کو شائع کی تھی۔ اس کتاب میں جناب برنی صاحب نے صاحبِ معاملہ جلال الدین اکبر ہی کی زبانی یہ واقعہ بیان کیا ہے۔

یونیورسٹی آف پنجاب کے ایم۔اے فارسی کے امتحان کا پرچہ 1929 میں علامہ اقبال نے ترتیب دیا تھا اور وہی اُس کے چیف اکزامنر بھی تھے۔ اُس میں کامیاب ہونے والے طالبِ علم کو انگریزی حکومت کی طرف سے وظیفہ ملتا تھا جس کی بنیاد پر اُسے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے سرکاری خرچ پر ولایت (London) بھیجا جاتا تھا۔ جلال الدین اکبر نے یہ امتحان دیا مگر اپنی توقعات کے برعکس وہ بہتر انداز میں پرچہ حل نہ کر سکا تھا۔ اسی لیے حافظ محمود شیرانی اور سر عبدالقادر نے اقبال سے سفارش کی کہ اگر اکبر فیل ہو جاتا ہے تو ریاستی وظیفہ ایک ہندو طالب علم کو چلا جائے گا۔ اس موقع پر علامہ اقبال نے دوٹوک انداز میں جواب دیا تھا ''وظیفہ تو مستحق طالبِ علم ہی کو ملنا چاہیے اور وہ طالب علم نہ صرف ایک اچھا شاعر ہے بلکہ فارسی میں بھی اچھی صلاحیت کا حامل ہے''۔ نتیجتاً اس سال 1929 کے امتحان میں جلال الدین اکبر سے دو نمبر زیادہ حاصل کرنے والے ہیرہ لعل چوپڑہ تھے جنھوں نے بعد میں فارسی میں ڈی لٹ کی ڈگری تہران سے حاصل کی تھی اور اپنا مقالہ وہاں کی یونیورسٹی میں فارسی زبان میں پیش کر کے اپنا لوہا منوایا تھا۔ بعد میں ہندوستان کلکتہ یونیورسٹی میں اسلامی تاریخ وتمدن کے صدر شعبہ رہے۔ اردو سے زیادہ انھوں نے فارسی میں شاعری کی اور اس پر علامہ اقبال سے اصلاح بھی لی تھی۔ ان کے والد دولت رام عیش بھی شاعر تھے۔ چنانچہ وہ اعتراف کرتے ہیں:

کیوں نہ ہو نظموں میں میری چاند تاروں کی پھبن
عیشؔ کا عشرتؔ ہوں، ہیرہ لعل ہوں اقبالؔ کا

ہیرہ لعل چوپڑہ (1906-1994)
عشرتؔ حافظ آبادی کے نام سے معروف تھے۔ تعلیمی دور کے علاوہ برسوں یہ ایران میں رہے اور وہاں حضرتِ امام حسینؓ کی شہادت اور میلاد النبی کے سلسلے میں کئی نظمیں کہہ کر ایرانیوں سے بھی داد پائی۔

ماخذ:

۱۔ اقبال نامے مرتبہ ڈاکٹر اخلاق اثر۔ تیسرا ایڈیشن 2006، مدھیہ پردیش اردو اکادیمی، بھوپال

۲۔ Iqbal poet patriot of India by SMH Barni 1987۔ (وکاس پبلشنگ ہاؤس، انصاری مارکٹ نئی دہلی 110002

☆☆☆

پریم چند: احوال و آثار

ڈاکٹر محمد عظمت الحق

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، دیگلور کالج، دیگلور۔ 431717 ضلع ناندیڑ (مہاراشٹرا) Mob:7020407042

اردو ادب کی تاریخ میں ایسے کئی نامور ادیب اور شاعر گزرے ہیں جنھوں نے اپنی بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں سے اردو ادب کے سرمائے میں قابلِ قدر اور قیمتی اضافہ کیا ہے۔ جب ہم فکشن کے حوالے سے بات کرتے ہیں تو سب سے پہلے ہماری نظر منشی پریم چند پر آ کر ٹھہرتی ہے۔ بلاشبہ وہ اردو کے ایسے فکشن نگار گزرے ہیں جن کا ثانی آج تک پیدا نہ ہو سکا۔ پریم چند اردو میں مختصر افسانے کے نہ صرف بانی ہیں بلکہ انھوں نے افسانے کی صنف کو فن کی معراج تک پہنچا دیا۔ یہی بات ان کی ناول نگاری پر بھی صادق آتی ہے۔

پیدائش اور بچپن کے حالات:

منشی پریم چند ۳۱ر جولائی ۱۸۸۰ء میں بنارس کے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں لمہی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام منشی عجائب لال تھا جو ڈاک خانے میں کلرک تھے۔ ملازمت کے علاوہ کھیتی باڑی بھی ان کا پیشہ تھا۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو پریم چند معاشی لحاظ سے نچلے متوسط گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ پریم چند کا اصلی نام دھنپت رائے تھا۔ ان کا ایک اور نام نواب رائے بھی تھا۔ اکثر مصنفین نے اس نام کو فرضی قرار دیا ہے لیکن بقولِ قمر رئیس یہ نام پریم چند کے چچا کا دیا ہوا تھا جو انھیں بہت پسند تھا۔(۱) ابتدا میں پریم چند اسی نام سے لکھتے تھے۔ ان کا تعلق سری واستو خاندان سے تھا جو ہندوؤں کی ایک ذات ''کائستھ'' کی ایک ذیلی شاخ ہے۔ کائستھ کو ''کایتھ'' بھی کہا جاتا ہے۔ اس برادری کے افراد کا پیشہ ابتدا ہی سے نوشت وخواند اور منشی گری رہا ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد ہندوؤں کی جس ذات نے سب سے پہلے فارسی زبان سے اپنا تعلق استوار کیا وہ یہی ذات ہے۔ بقول صاحبِ فرہنگِ آصفیہ:

> ہندوؤں میں سب سے اول سکندر لودھی کے وقت میں اسی قوم نے فارسی لکھنا پڑھنا اختیار کیا تھا۔ جس کے سبب سے اس قوم میں بڑے بڑے فاضل اور صاحبِ تصانیف ہوئے ہیں۔(۲)

پریم چند آٹھ سال کے تھے کہ ان کی والدہ آنندی دیوی کا طویل علالت کے بعد انتقال ہوا۔ والدہ کے انتقال کے بعد پریم چند اپنی دادی سے زیادہ مانوس ہو گئے تھے جو انھیں ہر رات کہانیاں سناتی تھیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ بچپن کی یہی سنی ہوئی کہانیوں نے ان کے دل و دماغ پر گہرا اثر ڈالا اور یہیں سے انھیں افسانے کے فن سے رغبت پیدا ہو گئی۔ اسی رغبت اور دلچسپی نے انھیں آخر کار ایک عظیم افسانہ نگار اور ناول نگار بنا دیا۔ پریم چند کے والد نے بہت جلد دوسری شادی کر لی۔ سوتیلی والدہ کے گھر میں آنے سے پریم چند کی زندگی نئے مسائل سے دوچار ہوئی۔ نئی بیوی آنے کے بعد (جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے) باپ کا رویہ اپنے پہلے بیٹے کے تئیں بدل گیا۔ اس اثنا میں دادی کا بھی انتقال ہو گیا جس سے وہ ماں کے بعد بہت مانوس تھے۔ پریم چند کا سارا بچپن دکھ درد، محرومیوں سے بھرا ہوا تھا۔ ماں اور دادی کے انتقال کے بعد وہ بے حد ملول اور افسردہ رہنے لگے تھے۔ سوتیلی ماں کا رویہ ان کے ساتھ ہمیشہ سے ظالمانہ رہا۔ باپ کی شفقت سے بھی محرومی ان کا مقدر بنی۔ ڈاکٹر قمر رئیس نے ہنس راج رہبر کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

> 'اب انھیں جھوٹے برتن ہی نہیں مانجھنے ہوتے تھے سوتیلی ماں کے بچے کو کھلانا بھی ہوتا تھا'۔(۳)

پریم چند کے لڑکپن کی محرومیوں کا ذکر کرتے ہوئے قمر رئیس لکھتے ہیں:

> 'پریم چند کی اس زمانے کی معاشی پریشانیوں اور تنگ دستیوں کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ مہینے میں بارہ آنے اسکول کی فیس دینا بھی ان کے

لیے دشوار ہوتا تھا۔سوتیلی ماں کی بد سلوکی اور غیر ہمدردانہ رویے سے انھیں کسی نیکی کی توقع نہ تھی۔ باپ کو اول تو اپنے ہی کاموں سے فرصت نہیں ملتی تھی۔اور اگر فرصت میسر بھی ہوتی تو انھیں نئی بیوی کے علاوہ کسی اور چیز کے متعلق سوچنے کا موقع نہیں ملتا۔ پریم چند اس پیار اور شفقت سے محروم تھے جو بالعموم اس عمر میں انسان کو ہوتی ہے اور جو اسکی شخصیت کے فطری نشو ونما میں معاون ہوتی ہے۔(۴)

تعلیم اور ملازمت:

پریم چند کی ابتدائی تعلیم کا آغاز پانچ سال کی عمر میں مکتب سے ہوا جہاں ایک مولوی صاحب انھیں فارسی اور اردو پڑھاتے تھے۔اس لحاظ سے بچپن ہی میں فارسی اور اردو سے ان کا تعلق استوار ہوا۔ پریم چند کی عمر چودہ سال کی تھی کہ ان کے والد کا تبادلہ گورکھپور ہوگیا۔ یہاں کے ایک مشن اسکول میں انھیں ششم جماعت میں شریک کر دیا گیا۔کہا جا سکتا ہے کہ پریم چند کی باقاعدہ اسکولی تعلیم کی شروعات یہیں سے ہوئی۔تقریباً تین سال گورکھپور میں رہنے کے بعد وہ اپنے گاؤں واپس ہوے اور بنارس کے کوئنس کالج میں نویں جماعت میں داخلہ لیا۔ پریم چند ابھی نویں جماعت ہی میں زیر تعلیم تھے کہ ان کے والد نے ۱۸۹۶ء میں ان کی شادی کر دی جبکہ ان کی عمر صرف سولہ سال کی تھی۔شادی کے ایک سال بعد ہی پریم چند کے والد کا انتقال ہوگیا۔اب اپنی بیوی، سوتیلی ماں اور اس کے دو بچوں اس طرح پانچ افراد کی کفالت کی ذمے داری پریم چند کے دوشِ ناتواں پر آپڑی۔ پریم چند وکالت کا امتحان کامیاب کر کے وکیل بننا چاہتے تھے۔بڑے نامساعد اور صبر آزما حالات میں انھوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا۔انھوں نے نامساعد حالات کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور میٹرک کا امتحان دوسرے درجے میں کامیاب کیا ۔کالج میں داخلہ لینا چاہتے تھے لیکن ریاضی کمزور ہونے کی وجہ سے داخلہ نہ مل سکا۔

میٹرک کامیاب کرنے کے فوری بعد پریم چند کو ایک اسکول میں اسسٹینٹ ٹیچر کی حیثیت سے عارضی طور پر ملازمت حاصل ہوئی۔ملازمت کے دوران ہی میں ۱۹۰۲ء میں انھیں سرکاری طور پر ٹریننگ کے لیے الہ آباد ٹریننگ کالج بھیج دیا گیا ۔یہاں سے پریم چند نے جونیئر انگلش ٹیچرس سرٹیفکیٹ کا امتحان پاس کر لیا۔ٹریننگ مکمل ہونے کے چند ماہ بعد پریم چند کو الہ آباد ماڈل اسکول کے صدر مدرس کے عہدے پر مامور کیا گیا۔

الہ آباد آئے ابھی چند مہینے ہی گزرے تھے مئی ۱۹۰۵ء میں ان کا تبادلہ کانپور ہوگیا۔۱۹۰۹ء میں پریم چند ترقی پا کر ڈپٹی سب انسپکٹر مدارس کی حیثیت سے مہوبہ (ضلع ہمیر پور) آگئے۔ ۱۹۱۴ء میں علاقے روہیل کھنڈ کے ضلع بستی میں ان کا تبادلہ ہوا۔۱۹۱۶ء میں پریم چند کا تبادلہ گورکھپور میں ہوا۔گورکھپور میں قیام کے دوران پریم چند نے بی۔اے کا متحان کامیاب کیا ۔ایم۔اے کا امتحان بھی دینا چاہتے تھے لیکن مسائل کی وجہ سے نہ دے سکے۔

۱۹۲۰ء کے اواخر میں ہندوستان کی جنگِ آزادی کی تحریک عروج پر تھی۔ پریم چند نے بھی اس تحریک میں دلچسپی لی۔ پریم چند کے دل میں انگریزی حکومت کے خلاف باغیانہ جذبات پل رہے تھے لیکن ابھی یہ چنگاری کی شکل میں تھے۔ پریم چند شروع ہی سے مہاتما گاندھی کے عقیدت مند تھے۔گورکھپور کے قیام کے دوران جب گاندھی جی ایک جلسے میں گورکھپور آئے تھے تو ان کی تقریر سننے کے لیے پریم چند بھی چلے گئے اور اس تقریر سے ایسے متاثر ہوے کہ فروری ۱۹۲۱ء میں سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ پریم چند کے استعفے کو ڈاکٹر قمر رئیس جذباتی فیصلہ نہیں بلکہ غور وفکر کا نتیجہ بتاتے ہیں۔اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

> ۔۔۔دراصل پریم چند نے بہت غور وفکر کے بعد یہ فیصلہ کیا تھا۔ان کے دل میں یہ شعور راسخ ہو چکا تھا کہ ادیب کے لیے صرف گفتار کا غازی ہونا کافی نہیں کردار کا مجاہد ہونا بھی ضروری ہے۔عمل کے بغیر فکر وخیال کی لے، لے تو ہو سکتی ہے فن نہیں بن سکتی۔اسے لوگ سن سکتے ہیں سر نہیں دھن سکتے وہ روک کر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر سکتی ہے انھیں آگے بڑھنے کا حوصلہ نہیں دے سکتی۔پھر یہ حقیقت بھی ان پر روشن ہو چکی تھی کہ ادیب جنگِ آزادی کا ہراول ہوتا ہے۔وہ پیچھے سے ہمتیں نہیں بندھاتا آگے بڑھ کر وار کرتا ہے اور یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ قومی آزادی کے غاصبوں اور دشمنوں کے نمک خوار بھی رہتے اور ان کے ظلم وجبر کا پردہ بھی فاش کرتے۔(۵)

سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دینے کے بعد پریم چند شدید قسم کے معاشی بحران کا شکار ہوے۔گزراوقات کے لیے کچھ نہ کچھ روزگار درکار تھا۔انھوں نے اپنے ایک دوست مہاویر پرشاد پوت دار کی پارٹنر شپ میں چرخوں کی تجارت کا کام شروع کیا لیکن یہ کاروبار نہ چل سکا۔ چند ماہ بعدکانپور کے ایک اسکول ''ماروا ڑی ودیالیہ'' میں صدر مدرسی کی حیثیت سے خدمات انجام دیں لیکن بہت جلد یہ نوکری بھی چھوڑ دی۔سال بھر کے لیے لکھنؤ میں قائم گنگا پستک مالا میں بھی ملازمت کی جہاں وہ نصابی کتابوں کی تیاری کا کام کرتے رہے۔

پریس کا قیام اور رسائل کی ادارت:

۱۹۲۲ء میں پریم چند نے بنارس سے شائع ہونے والے ہندی ماہنامے'' مریادا'' کے مدیر مقرر ہوے۔ یہاں پبلیشنگ کے کاروبار سے واقفیت حاصل ہوئی تو انھیں اس کاروبار میں دلچسپی پیدا ہوئی اوراب وہ خود اس کاروبار کو شروع کرنے کا ارداہ کیا۔ پریم چند ایک ایسا پبلیشنگ ادارہ قائم کرنا چاہتے تھے جہاں سے اعلیٰ معیار کی کتابیں شائع ہوں۔اس مقصد کے پیشِ نظر انھوں نے ۱۹۲۳ء میں بنارس میں سرسوتی پریس کے نام سے پارٹنر شپ میں پریس قائم کیا۔اس کاروبار میں نقصان ہوتا دیکھ کر پریم چند کے پارٹنر اپنا پیسا لے کر علاحدہ ہو گئے۔لیکن پریم چند نے مستقل مزاجی سے پریس کو قائم رکھا اور نقصان برداشت کرتے رہے۔

۱۹۲۹ء میں پریم چند ہندی کے مشہور رسالے'' مادھوری'' کے مدیر مقرر ہوے۔ کو اس رسالے کی ادارت کے دوران میں پریم چند کی مدیرانہ صلاحیتوں کو فروغ حاصل ہوا۔ ۱۹۳۰ء میں پریم چند نے سرسوتی پریس سے ہندی ماہنامہ ''ہنس'' جاری کیا۔اس رسالے کے جاری کرنے کے ایک سال بعد وہ ''مادھوری'' سے علاحدہ ہو گئے اور اپنے پرچے کی ترتیب واشاعت میں پورا وقت لگانے لگے۔ بہت جلد یہ پرچہ ہندی کا مقبول اور معیاری پرچہ بن گیا۔ یہاں سے پریم چند ایک بہترین مدیر کی حیثیت سے ادبی دنیا میں متعارف ہوے۔''ہنس'' جاری کرنے کے کچھ دن بعد پریم چند نے ہندی زبان ہی میں ایک ہفت روزہ اخبار'' جاگرن'' کے نام سے جاری کیا۔ ان پرچوں کی اشاعت سے بھی پریم چند کو خاطر خواہ آمدنی نہ ہوئی بلکہ نقصان ہی ہوتا رہا لیکن انھوں نے پورے عزم اور حوصلے کے ساتھ ان پرچوں کو جاری رکھا۔ان پرچوں کی اجرائی کا مقصد پریم چند کے نزدیک نفع کمانا نہیں بلکہ صالح ادب کا فروغ تھا۔ پریم چند نے اپنے اداریوں اور مضامین کے ذریعے سماجی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا اور اہلِ وطن کے دلوں میں جنگِ آزادی کی تحریک میں حصہ لینے کی ترغیب وتشویق پیدا کی۔

بمبئی میں قیام اور فلمی دنیا سے وابستگی:

پریم چند نے''ہنس'' اور'' جاگرن'' کو غیر تجارتی نقطۂ نظر سے جاری کیا تھا۔اس لیے ان پرچوں سے انھیں کوئی خاص مالی نفع حاصل نہ ہوا بلکہ نقصان ہی ہوتا رہا۔وہ اس نقصان کو برابر برداشت کرتے رہے لیکن اپنے پرچوں کی اشاعت کو مسدود نہ کیا۔۱۹۳۴ء میں بمبئی کی اجنتا سینی ٹون فلم کمپنی نے پریم چند کو معقول معاوضے پر فلمی کہانیاں لکھنے کی پیشکش کی ۔ پریم چند نے اس پیشکش کو قبول کیا اور بمبئی چلے گئے۔بقول ڈاکٹر قمر رئیس:

> پریم چند کو دولت کمانے کی ہوس نہیں تھی لیکن محض یہ سوچ کر کے اس طرح وہ ہنس'' اور'' جاگرن'' کی اشاعت سے ہونے والے نقصان کو پورا کر کے انھیں زندہ رکھ سکیں گے۔بمبئی جانے کے لیے رضامند ہو گئے۔پھر یہ خیال بھی ان کے ذہن میں تھا کہ فلم کے وسیلے سے وہ اپنے خیالات زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچا سکیں گے۔(۶)

پریم چند ایک مقصد لے کر بمبئی گئے اور فلمی دنیا سے وابستگی قبول کی لیکن انھیں وہاں اپنے مقصد میں کامیابی ملتی نظر نہیں آئی۔اصل میں پریم چند خالص ادبی انسان تھے ان کے کچھ اصول اور آدرش تھے جن سے وہ سمجھوتا نہیں کر سکتے تھے۔فلمی دنیا کے حالات اور وہاں کا طرزِ زندگی پریم چند کو پسند نہ آیا۔اس لیے وہ بہت جلد اس دنیا سے کنارہ کش ہو گئے۔ڈاکٹر عبدالستار دلوی رقم طراز ہیں:

> 'پریم چند کے سفرِ بمبئی کا بنیادی مقصد قرض کے بوجھ سے چھٹکارا حاصل کرنا اور اپنے رسائل'' جاگرن'' اور '' ہنس'' کو جاری رکھنا تھا۔ان رسائل کی اشاعت کے ذریعے جو ان کے مقصدِ زندگی کو پورا کر رہے تھے پریم چند کو بہت عزیز تھا۔اگر چہ وہ اپنے آپ کو فلمی دنیا کے مطابق نہ کر سکے تاہم فلمی زندگی

اپنانے کی وجہ ایک بلند مقصد اور مطمحِ نظر اور آدرش کو پا لینے کی خواہش تھی جو انھیں بمبئی میں پورا ہوتے دکھائی دے رہا تھا۔ تاہم جب انھوں نے محسوس کیا کہ یہاں پر بہت سے کام ان کے مقصدِ زندگی کے خلاف محض تجارتی نقطۂ نظر سے کرنے پڑتے ہیں تو انھوں نے اس زندگی سے چھٹکارا حاصل کرنے ہی میں راحت وسکون محسوس کیا'۔(۷)

دراصل پریم چند کو فلمی زندگی کی بے ہودگیاں، عریانیت اور کلچر قطعی پسند نہ آیا۔ وہ فلم سے بھی سماجی اصلاح کا کام لینا چاہتے تھے لیکن یہاں ہر قسم کی برائیاں موجود تھیں۔ حسام الدین غوری کے نام لکھے گئے ۱۹ مارچ ۱۹۳۵ء کے ایک خط میں پریم چند نے فلمی دنیا کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان سے فلمی دنیا سے متعلق ان کا مطمحِ نظر واضح ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

'سینما میں کسی اصلاح کی توقع کرنا بے کار ہے۔ یہ صنعت بھی اسی طرح سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہے جیسے شراب فروشی۔ انھیں اس سے بحث نہیں کہ پبلک کے مذاق پر کیا اثر پڑتا ہے۔ انھیں تو اپنے پیسے سے مطلب ہے۔ برہنہ رقص، بوسہ بازی اور مردوں کا عورتوں پر حملہ۔ یہ بس ان کی نظروں میں جائز ہے۔ پبلک کا مذاق اتنا گر گیا ہے کہ جب تک یہ مخرب اور حیا سوز نظارے نہ ہوں اس تصویر میں مزہ نہیں آتا۔ مذاق کی اصلاح کا بیڑہ کون اٹھائے۔ سینما کے ذریعے مغرب کی ساری بے ہودگیاں ہمارے اندر داخل کی جا رہی ہیں۔ اور ہم بے بس ہیں۔ جب ایکٹریسوں اور ایکٹروں کی تصویریں دھڑا دھڑ چھپیں اور ان کے کمال کے قصیدے گائے جائیں تو کیوں نہ ہمارے نوجوانوں پر اس کا اثر ہو۔'۔(۸)

شادی اور ازدواجی زندگی:

جیسا کہ پچھلی سطور میں کہا گیا کہ پریم چند کی شادی سولہ برس کی عمر میں ہوئی جب کہ وہ نویں جماعت میں زیرِ تعلیم تھے۔ پریم چند کی ابتدائی ازدواجی زندگی بے حد ناخوشگوار رہی۔ ان کا اپنی پہلی بیوی سے نباہ نہ ہو سکا۔ ساس بہو میں آئے دن تکرار ہوا کرتی تھی۔ گھریلو تنازعات نے اتنا طول کھینچا کہ آخر کار پریم چند کی بیوی گھر چھوڑ کر میکے چلی گئی اور کبھی واپس نہیں آئی، پریم چند نے بھی اسے واپس لانے کی کوشش نہیں کی۔ پریم چند نے اپنی سوتیلی ماں کے مشورے اور اصرار پر دوسری شادی کر لی۔ پریم چند دوسری شادی کے لیے تیار تو ہوے لیکن ودھوا کے ساتھ۔ چنانچہ ان کی دوسری شادی بال ودھوا سے ہوئی جس کا نام شورانی دیوی تھا۔ شورانی دیوی اس شادی کے بارے میں لکھتی ہیں:

'مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ میری شادی کہاں ہو رہی ہے۔ میری شادی میں آپ کی چاچی وغیرہ کی کوئی رائے نہیں تھی مگر یہ آپ کی دلیری تھی۔ آپ سماج کا بندھن توڑنا چاہتے تھے۔ یہاں تک کہ اپنے گھر والوں کو بھی خبر نہیں دی'۔(۹)

دراصل پریم چند ودھوا سے شادی کر کے ہندو سماج میں موجود غیر لچکدار، سخت اور فرسودہ روایات ورسوم اور دستور وقانون کو توڑنا چاہتے تھے۔ پریم چند کے اس جذبے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہندو سماج کے فرسودہ عائلی نظام کے تئیں وہ نہایت باغیانہ خیالات رکھتے تھے۔ پریم چند کی بال ودھوا سے شادی پر اظہارِ خیال کرتے ہوے ڈاکٹر قمر رئیس رقم طراز ہیں:

'پریم چند نے اپنے گھر والوں کی مرضی کے خلاف اور سماج کے فرسودہ بندھنوں کو توڑ کر ایک بیوہ یا ''بال ودھوا'' سے شادی کی تھی۔ ان کا یہ جرأت مندانہ قدم اس طویل جدوجہد کا پہلا باب ہے جو وہ سماجی مذمومات کے خلاف تمام زندگی اپنے عمل اور اپنے قلم سے انجام دیتے رہے۔ اور جس راہ میں کوئی لالچ اور خوف انھیں آگے بڑھنے سے نہ روک سکا'۔(۱۰)

اندرناتھ مدان کے نام لکھے گئے ایک خط میں پریم چند نے اپنی پہلی بیوی اور دوسری شادی کے بارے میں لکھا ہے کہ:

'میری پہلی بیوی ۱۹۰۴ء میں انتقال کر گئی۔ بے چاری بدقسمت اور معمولی شکل وصورت کی عورت تھی۔ گو کہ اس سے مطمئن نہ تھا تاہم روایتی شوہروں کی طرح اس سے نباہ کرتا رہا۔ اس کی وفات کے بعد میں نے ایک بال ودھوا سے شادی کر لی، اور اس کے ساتھ کافی خوشی کی زندگی گزر رہی ہے۔ اس نے کچھ ادبی ذوق بھی پیدا کر لیا ہے۔ اور کبھی کبھی کہانیاں بھی لکھ لیتی ہے۔ وہ نڈر، دلیر، مخلص اور سمجھوتہ نہ کرنے والی عورت ہے'۔(۱۱)

یہاں پریم چند نے اپنی پہلی بیوی

بارے میں غلط بیانی سے کام لیا ہے۔اس غلط بیانی ہاں پر تبصر ہکرتے ہوئے ڈاکٹر قمر رئیس لکھتے ہیں:

'پریم چند کا یہ بیان واقعے کے خلاف ہے اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح وہ اصل واقعے کو چھپا کر ایک سنگین الزام سے بری ہونا چاہتے ہیں اس لیے کہ نہ تو ان کی پہلی بیوی کا انتقال ۱۹۰۴ء میں ہوا اور نہ ہی پریم چند نے دوسری شادی اس کے موت کے بعد کی۔ یہ ایک ایسی کھلی حقیقت ہے جس کا اعتراف ان کے سبھی سوانح نگاروں نے کیا ہے۔ یہاں تک کہ ان کی دوسری بیوی شورانی دیوی نے بھی۔ موصوفہ نے یہاں تک لکھا ہے کہ جب مجھے معلوم ہوا (پریم چند نے ابتداً اپنی پہلی شادی کا حال ان سے چھپایا تھا) تو میں نے ان سے بار ہا استدعا کی کہ وہ پہلی بیوی کو بھی گھر میں لا کر رکھیں لیکن وہ تیار نہ ہوئے'۔(۱۲)

پریم چند جیسے جرأت مند انسان اور غلط رسم ورواج کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے والے ایک عظیم فنکار سے ایسی غلط بیانی افسوس ناک ہے۔ یہ غلط بیانی ان کے کردار کے ایک کمزور پہلو کی غماز ہے۔ خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا۔ پریم چند کے اس خط کے مشمولات سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی دوسری بیوی سے نہایت خوش تھے۔ شورانی دیوی نہ صرف پریم چند کی ہم مزاج تھیں بلکہ بقول پریم چند وہ ادبی ذوق کی حامل بھی تھیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وہ کہانیاں بھی لکھتی تھیں۔

پریم چند کا مزاج اور شخصیت:

پریم چند خوددار اور بے ریا انسان تھے۔ زندگی سے متعلق ان کے کچھ آدرش اور اصول تھے جس پر انھوں نے ساری زندگی گزاری۔ وہ دیہات میں پیدا ہوئے تھے اور دیہاتی زندگی کو قریب سے دیکھا تھا۔ ان کے مزاج میں وہی دیہی سادگی تھی۔ وہ خوش اخلاق انسان تھے۔ ساری عمر تنگی اور ترشی میں رہے لیکن نہ انگریزی حکومت کی قصیدہ خوانی کی اور نہ مال ودولت کے پیچھے پڑے۔ حکومتِ برطانیہ نے ۱۹۲۹ء میں پریم چند کو رائے بہادر کے خطاب سے نوازا لیکن انھوں نے اس خطاب کو قبول نہیں کیا۔ اگر وہ چاہتے تو فلمی دنیا سے مستقل وابستہ رہ کر پیسہ کما سکتے تھے لیکن فلمی دنیا ان کے مزاج سے میل نہیں کھاتی تھی اس لیے اسے خیر باد کہہ دیا۔ پریم چند کے طرزِ بود وباش اور ان کے مزاج کی عکاسی کرتے ہوئے حسن منظر نے لکھا ہے:

'پریم چند کی زندگی، ماں کے انتقال سے لے کر چھپن سال کی عمر میں اپنے انتقال تک۔ کم وبیش تنگی وترشی کی زندگی تھی۔ لیکن حالات نے انھیں نہ موقع پرست بنایا، جس کے کتنے ہی مواقع ملے، نہ دھن دولت کا پجاری۔ ان کی خودداری اور اعلیٰ حوصلگی نے نہ انھیں کسی رجواڑے سے وابستہ ہونے دیا نہ انھوں نے حکومتِ برطانیہ کا پیش کیا ہوا خطاب قبول کیا۔ ان کی زندگی بڑی ہموار زندگی تھی۔ یہ نہیں کہ کبھی غیر ملکی حکمرانوں کی مدح میں ناول یا اسکرین پلے لکھ رہے ہیں۔ اور کبھی ایسی کہانیاں، جن کا مقصد حکمرانوں کی جگہ ان کی قوم سے نفرت پیدا کرنا ہو۔ انھوں نے، جہاں بھی انھیں برطانوی لوگوں میں کوئی خوبی نظر آئی اس کی کھل کر تعریف کی۔ اور جہاں اپنوں میں برائی دیکھی اسے بھی چھپانے کی کوشش نہیں کی'۔(۱۳)

پریم چند سادگی کا پیکر تھے۔ ان کی زندگی شہری تکلفات کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی۔ وہ جہاں بھی رہے سادہ زندگی بسر کی۔ نمود ونمائش اور ٹھاٹ باٹ سے وہ کوسوں دور تھے۔ پریم چند نے جب فلمی دنیا میں قدم رکھا تو وہاں بھی ان کی وہی سادگی تھی۔ بقولِ ضیاء الدین برنی:

'بمبئی میں پریم چند کی زندگی انتہائی سادہ تھی، اتنی سادہ کہ اس سے زیادہ سادگی کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی ذاتی ضروریات اس درجہ کم تھیں کہ انھیں چھوٹے پیمانے پر مہاتما کہا جاسکتا ہے۔ وہ ہر شخص سے خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ ان کی شرافتِ نفس کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ انھوں نے اپنی زبانِ قلم سے کبھی کسی کا دل نہیں دکھایا۔(۱۴)

منشی دیا نرائن نگم سے رفاقت اور ''زمانہ'' سے وابستگی:

پریم چند جب ملازمت کے سلسلے میں کانپور آئے تو یہاں ان کی ملاقات اپنے وقت کے مشہور رسالے ''زمانہ'' کے اڈیٹر منشی دیا نرائن نگم سے ہوئی۔ یہ ملاقات، بہت جلد دوستی میں بدل گئی اور پریم چند کی وفات تک یہ دوستی برقرار رہی۔ کانپور میں ابتداً پریم چند کا قیام دیا نرائن نگم کے

رہا۔ یوں تو پریم چند کے قدر دان اور ان کو چاہنے والوں کا دائرہ وسیع تھا لیکن ان میں دیا نرائن نگم کو امتیازی حیثیت حاصل تھی۔ دیا نرائن نگم اور پریم چند کی دوستی منفرد اور بے مثال تھی۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ دیا نرائن نگم کی رفاقت سے پریم چند کی زندگی میں ایک نئے اور اطمینان بخش دور کا آغاز ہوا۔ کانپور کے قیام، نگم کی رفاقت اور ''زمانہ'' سے وابستگی کے بعد ہی سے پریم چند کی ادبی زندگی کا باضابطہ آغاز ہوتا ہے۔ یہاں انھیں تصنیف اور تالیف کے بہترین مواقع میسر ہوے۔ پریم چند رسالہ ''زمانہ'' کے مستقل قلم کار تھے۔ انھوں نے ''زمانہ'' کے اسسٹینٹ اڈیٹر کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں۔ قیامِ کانپور کے دوران دیا نرائن نگم کی رفاقت اور وہاں کے ادبی حلقوں میں اٹھنے بیٹھنے سے پریم چند کے ذوقِ ادب کو جلا ملی اور تصنیف وتالیف کے شوق کو پر پرواز میسر آئے۔ خود دیا نرائن نگم کو بھی پریم چند کی صحبتوں پر ناز تھا۔ وہ ان صحبتوں کو اپنی زندگی کا بہترین زمانہ قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ ان صحبتوں سے متعلق وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

'کئی سال تک ایک ساتھ رہنے کا اتفاق رہا۔ اور یہ میری زندگی کا بہترین زمانہ تھا۔ پریم چند، نوبت رائے نظؔر اور درگا سہائے سرورؔ اور کئی احباب واعزا، شام کے وقت دو تین گھنٹے کیلئے یک جا ہو جاتے اور زندگی کا کوئی مرحلہ اور دین دنیا کا کوئی مسئلہ یارانِ بے تکلف کے غور وفکر سے محفوظ نہ رہتا۔'(۱۵)

قیامِ کانپور کا دور پریم چند کے لیے ادبی اعتبار سے نہایت سازگار رہا۔ رسالہ ''زمانہ'' سے وابستگی، دیا نرائن نگم سے رفاقت اور دیگر ادیبوں کی صحبتوں نے پریم چند کے ذہن وفکر کی تعمیر وتشکیل میں اہم رول ادا کیا ہے۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''سوزِ وطن'' بھی ''زمانہ پریس'' کانپور ہی سے شائع ہوا۔ پریم چند کے ذہن وفکر کی تشکیل اور ان کی مقبولیت اور شہرت میں رسالہ ''زمانہ'' کے کردار سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

پریم چند کی علالت اور وفات:

۱۹۳۴ء میں پریم چند بمبئی تشریف لے گئے جہاں مختصر مدت کے لیے انھوں نے فلمی دنیا سے وابستگی اختیار کر لی تھی۔ قیامِ بمبئی کے دوران ان کی صحت خراب ہوگئی۔ ۱۹۳۵ء میں بمبئی سے وہ بنارس واپس آ گئے۔ لیکن صحت بدستور خراب ہی رہنے لگی۔ انھیں ہاضمے کی شکایت تھی۔ علاج ومعالجے کے باوجود افاقہ نہ ہوا۔ ۱۹۳۶ء میں علالت نے زور پکڑا اور آخر کار ۸/اکتوبر ۱۹۳۶ء کو پریم چند نے اس دنیا سے رختِ سفر باندھا۔ پریم چند نے چھپن برس کی عمر پائی۔ یہ عمر کم نہیں تو زیادہ بھی نہیں۔ انھیں دس بیس برس اور حیات نصیب ہوتی تو وہ اردو اور ہندی ادب کے ذخیرے میں اور بھی خوبصورت اضافہ کرتے۔ ان کی بے وقت موت سے اردو اور ہندی ادب کو جو نقصان پہنچا اس کی تلافی ممکن نہیں۔ بلاشبہ وہ عظیم تخلیق کار تھے۔ علی سردار جعفری نے پریم چند کی موت کو بے وقت کی موت قرار دیتے ہوے لکھا ہے کہ:

'پریم چند کی قبل از وقت موت نے اردو اور ہندی ادب کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ اور میں ان کے بارے میں وہی کہنا چاہتا ہوں جو کارل مارکسؔ نے انگریزی شاعر شیلیؔ کی موت پر کہا تھا۔ اگر پریم چند زندہ رہ جاتے تو وہ اس عہد کے سب سے بڑے انقلابی ادیب ہوتے'۔(۱۶)

پریم چند کی ادبی خدمات:

پریم چند اردو کے عظیم اور عہد ساز ادیب گزرے ہیں۔ انھوں نے اپنی تخلیقات سے اردو ادب کو مالا مال کیا ہے۔ انھوں نے بیسویں صدی کے آغاز سے لکھنا شروع کیا اور اپنی وفات تک مسلسل لکھتے رہے۔ انھوں نے اپنی تخلیقات میں ہندوستان کی سماجی، سیاسی اور معاشی زندگی کے بے شمار پہلوؤں کو نہایت فن کارانہ چابک دستی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ پریم چند نے اپنے افسانوی ادب کے ذریعے ہندوستان میں پھیلی ہوئی سماجی وسیاسی برائیوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔ وہ ایک اصلاح پسند فن کار تھے۔ پریم چند ادب برائے زندگی کے قائل تھے اور ساری عمر اپنے اسی نظریے کے تابع رہے۔ پریم چند اردو میں مختصر افسانے کے بانی ہی نہیں تھے بلکہ انھوں نے فنِ افسانہ نگاری کو بامِ عروج پر بھی پہنچایا۔ دراصل پریم چند نے اردو کے افسانوی ادب کو ایک نئی جہت سے آشنا کیا۔ وہ ایک ایسے حقیقت نگار فکشن نگار تھے جس کا کوئی ثانی اردو ادب آج تک پیش نہ کر سکا۔

پریم چند نے بارہ ناول اور سینکڑوں کہانیاں لکھیں۔ انکے ناولوں کے نام بالترتیب اس طرح ہیں۔ ''اسرارِ معابد'' ''ہم خرما وہم ثواب'' ''جلوۂ ایثار'' ''بازارِ حسن'' ''گوشۂ عافیت'' ''نرملا'' ''چوگانِ ہستی'' ''بیوہ'' ''پردۂ مجاز''

''غبن'' ''میدانِ عمل''''گئودان''''منگل سوتر''
پریم چند کا آخری ناول ہے جو نامکمل ہے۔

پریم چند کے تقریباً تمام ناول اصلاحی نقطۂ نظر سے لکھے گئے ہیں۔انھوں نے اپنے ناولوں کے ذریعے ہندوستان کے گوناگوں مسائل کو پیش کیا ہے جن میں کسانوں اور دبے کچلے طبقات کو اولیت حاصل ہے۔دیہاتی زندگی اور اس کے مسائل کی جس خوبصورتی سے انھوں نے عکاسی کی ہے اس کا جواب نہیں۔ان کے ناولوں سے ہندوستان کی مٹی کی خوشبو آتی ہے۔ان کے ناولوں کے ہر صفحے پر ہندوستان کی دیہی زندگی کے انمٹ نقوش نظر آتے ہیں۔

پریم چند اردو کے مایۂ ناز اور عظیم افسانہ نگار ہیں۔دراصل اردو میں افسانہ نگاری کے بانی وہی ہیں۔پریم چند کی افسانہ نگاری کا آغاز حب الوطنی سے ہوتا ہے۔ان کے افسانوں کے پہلے مجموعے ''سوزِ وطن'' میں شامل تمام افسانے ان کی حب الوطنی کے غماز ہیں۔سماجی اصلاح ،وطن کی خدمت،انسانیت دوستی،قومی یکجہتی،دیہاتی زندگی اور کسانوں کے مسائل وغیرہ ان کے افسانوں کے اہم موضوعات ہیں۔سماجی حقیقت نگاری پریم چند کے افسانوں کی سب سے اہم خصوصیت ہے ۔پریم چند نے اپنے افسانوں کے ذریعے جنگِ آزادی کی تحریک میں بھی روح پھونکی۔وہ ادب کو تفریح کا ذریعہ نہیں بلکہ ملک وقوم کی خدمت کا وسیلہ سمجھتے تھے۔پریم چند کے تمام افسانوں میں ان کا یہ نقطۂ نظر نمایاں ہے۔انھوں نے ہندو سماج میں صدیوں سے چلے آرہے بے جا رسم ورواج ،توہم پرستی،مذہبی استحصال،سخت اور غیر لچکدار نظامِ زندگی پر کڑی نکتہ چینی کرتے ہوئے صدائے احتجاج بلند کی۔اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ نئے ہندوستان کی تعمیر اور قومی مزاج کی تشکیل میں پریم چند کے افسانوں کا بھی کچھ نہ کچھ حصہ ہے۔

پریم چند نے اردو افسانے کو تکنیک اور فن کے اعتبار سے بھی بلندی عطا کی۔پریم چند ہی وہ پہلے افسانہ نگار ہیں جنھوں افسانے کے خدوخال متعین کیے۔انھوں نے اردو افسانے کو اس مقام تک پہنچایا جو اردو افسانے کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔اس اعتبار سے پریم چند کے موضوعات ہی اہم نہیں بلکہ ان کا فن بھی اہمیت کا حامل ہے۔پریم چند کے افسانوں کی زبان صاف،سادہ اور سلیس ہے۔وہ روزمرہ کی بول چال کی زبان استعمال کرتے ہیں۔سادگی اور سلاست ان کی زبان کی اہم خوبیاں ہیں۔

پریم چند نے تین سو سے زائد افسانے لکھے ہیں۔ان کے افسانوں کے چودہ مجموعے شائع ہوئے ہیں جن کے نام مع سنین اس طرح ہیں:

(۱) سوزِ وطن(۱۹۰۸ء)،(۲)پریم پچیسی جلد اول(۱۹۱۵ء)،(۳)پریم پچیسی جلد دوم (۱۹۱۸ء)،(۴)پریم بتیسی جلد اول (۱۹۲۰ء) (۵) پریم بتیسی جلد دوم(۱۹۲۰ء)،(۶)خاکِ پروانہ(۱۹۲۸)،(۷)خواب وخیال(۱۹۲۸ء) (۸)فردوسِ خیال(۱۹۲۹ء)،(۹) پریم چالیسی جلد اول(۱۹۳۰ء)،(۱۰) پریم چالیسی جلد دوم(۱۹۳۰ء)(۱۱) آخری تحفہ(۱۹۳۴ء)،(۱۲) زادِ راہ(۱۹۳۶ء)،(۱۳) دودھ کی قیمت (۱۹۳۷)،(۱۴)واردات(۱۹۳۸ء)۔

کفن،نمک کا داروغہ،بڑے گھر کی بیٹی،حجِ اکبر،عید گاہ،پوس کی رات،گلی ڈنڈا، دوبیل، پنچایت،ٹھاکر کا کنواں،زادِ راہ،دنیا کا سب سے انمول رتن، وغیرہ پریم چند کے چند مشہور ترین اور لاجواب افسانے ہیں۔

حوالے:

(۱)قمر رئیس،پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثیتِ ناول نگار(ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۰۹ء)ص ۲۷

(۲)فرہنگِ آصفیہ(قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان دہلی،۱۹۹۸ء) جلد دوم،ص۱۵۴۴

(۳)قمر رئیس،پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثیتِ ناول نگار(ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۰۹ء)ص ۳۱

(۴)ایضاً ص ۳۲ (۵)ایضاً ص ۴۹

(۶)ایضاً ص ۵۴

(۷)عبدالستار دلوی''پریم چند کا قیامِ بمبئی''،مشمولۂ نئی تحریریں(موڈرن پبلیشنگ ہاؤس دہلی،۱۹۸۶ء)ص ۳۵

(۸)کلیاتِ پریم چند،مرتب مدن گوپال(قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان دہلی،۲۰۰۱ء)جلد ۷ص ۵۴۹

(۹)بحوالۂ مانک ٹالا،پریم چند:حیاتِ نو(موڈرن پبلیشنگ ہاؤس دہلی،۱۹۹۳ء)ص ۹۸

(۱۰)قمر رئیس،پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثیتِ ناول نگار(ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی،۲۰۰۹ء)ص ۴۰

(۱۱)کلیاتِ پریم چند،مرتب مدن گوپال(قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان دہلی،۲۰۰۱ء)جلد ۷ص ۵۸۲

(۱۲)قمر رئیس،پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثیتِ ناول نگار(ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی،۲۰۰۹ء)ص ۴۰

(۱۳)حسن منظر''پریم چند ان کا گھرانہ ان کا دور''،مشمولۂ نیا ورق ممبئی،جلد ۳ شمارہ ۱۱،نومبر تا جون ۲۰۰۱ء ص ۳۲

(۱۴)بحوالۂ ڈاکٹر عبدالستار دلوی''پریم چند کا قیامِ بمبئی''،مشمولۂ نئی تحریریں(موڈرن پبلیشنگ ہاؤس دہلی،۱۹۸۶ء)ص ۳۵

(۱۵)بحوالۂ قمر رئیس،پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثیتِ ناول نگار(ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی،۲۰۰۹ء)ص ۳۷

(۱۶)سردار جعفری،ترقی پسند ادب(انجمن ترقی اردو ہند،علی گڑھ،۱۹۵۷ء)ص ۱۴۲

☆☆☆

شمس الرحمٰن فاروقی کی رباعی گوئی: ایک تنقیدی مطالعہ

مجتبیٰ حسن صدیقی

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، لکھنؤ کیمپس۔ Mob: 8960799850

شمس الرحمٰن فاروقی (۳۰ ستمبر ۱۹۳۵۔ ۲۵ دسمبر ۲۰۲۰) اردو ادب کی نابغۂ روزگار شخصیتوں میں سے ایک تھے۔ اردو ادب کا کوئی ایسا گوشہ نہیں جو ان کے فیوض و برکات سے محروم ہو۔ وہ جدیدیت کے علم بردار اور نظریہ ساز نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ تخلیقی سطح پر بھی منفرد و ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ تخلیق، تنقید اور تحقیق تینوں میدانوں میں ان کے اشہب قلم نے نئی راہیں ایجاد کیں اور نئے منازل قائم کئے۔ لیکن بطور نقاد ان کی شخصیت اتنی باوزن اور رعب دار تھی کہ ان کے دیگر فنی کمالات دب کر رہ گئے۔

فاروقی نے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز افسانوں سے کیا مگر جلد ہی وہ شعر گوئی کی طرف مائل ہو گئے۔ ان کی شاعری مروجہ تصورات اور نظریات کی ترجمان نہ ہو کر ذاتی محسوسات کی آئینہ دار ہے۔ اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لئے انہوں نے اظہار کے بنے بنائے تمام سانچوں سے اجتناب کرتے ہوئے ایک ایسے پیرایۂ اظہار کی تخلیق کی جو بڑی مشاقی اور متواتر علمی تجربہ ہونے کے بعد وجود میں آتا ہے۔ جس میں ایک قسم کی تیزی پائی جاتی ہے۔ جو شعری فضا کو گرم رکھتا ہے۔ بلراج کومل 'شمس الرحمٰن فاروقی کی شاعری: ایک مطالعہ' میں لکھتے ہیں:

> ''ایک بات طے شدہ ہے کہ فاروقی کی شاعری کا مطالعہ جسمانی تفصیلات، محاکات، بیانات اور نظریات کے سلاسل میں رہ کر نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ فاروقی کے کم و بیش تمام تر تجربات کی نوعیت مابعد الطبیعاتی ہے۔ ان تجربات کا ادراک صرف جذباتی، فکری اور روحانی سطح پر ہو سکتا ہے۔ اگر ہم بیانات اور نظریات کے سلاسل سے آزاد ہونے کی جرأت اور ہمت نہیں رکھتے تو فاروقی کی شاعری کے اکثر نازک گوشے ہماری نظروں سے اوجھل رہیں گے۔''
>
> (ماہ نامہ کتاب نما، شمس الرحمٰن فاروقی (شخصیت اور ادبی خدمات) مرتب، احمد محفوظ، ماہنامہ کتاب نما، جامعہ نگر نئی دہلی، نومبر ۱۹۹۴ء ص: ۸۴)

فاروقی کی شاعری فرد کے ذاتی احساسات اور اندرونی تصادم کی شاعری ہے۔ انہوں نے متعدد اصنافِ سخن کو اپنا وسیلۂ اظہار بنایا۔ نظم، غزل، تضمین، نظموں کے تراجم وغیرہ کے ساتھ ساتھ انہوں نے رباعیوں میں بھی اپنے خیالات و تصورات کو پیش کیا ہے۔ ان کا پہلا مجموعہ 'گنجِ سوختہ' کے نام سے ستمبر ۱۹۶۹ میں شائع ہوا۔ جس میں ۱۹۵۹ سے ۱۹۶۹ تک کا کلام شامل ہے۔ اس مجموعے میں جہاں غزلیں اور نظمیں ہیں وہاں ۵ رباعیاں بھی ملتی ہیں۔

اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ فاروقی کی رباعی گوئی کا آغاز ۷۰ کی دہائی کے ابتدائی سالوں میں ہو چکا تھا۔دوسرا مجموعہ 'سبز اندر سبز' نومبر ۱۹۷۴ میں منظرِ عام پر آیا۔جس میں ۱۹۶۹ سے ۱۹۷۴ تک کا کلام شامل ہے۔اس میں فاروقی نے رباعی کی طرف خاص توجہ دی۔اس مجموعے میں رباعیوں کی کل تعداد ۲۲ ہے ۔فاروقی کا تیسرا مجموعہ رباعیوں کا مجموعہ ہے، جو ۷۵ رباعیوں پر مشتمل ہے۔'چار سمت کا دریا' کے عنوان سے یہ مجموعہ دسمبر ۱۹۷۷ میں شائع ہوا۔اس مجموعے میں وہ رباعیاں بھی شامل ہیں جو 'گنجِ سوختہ' اور 'سبز اندر سبز' میں موجود ہیں۔اس مجموعے کی فنی اہمیت یہ ہے کہ اس کی رباعیاں بحرِ ہزج کے چوبیسوں اوزان میں کہی گئیں ہیں۔فاروقی کا چوتھا شعری مجموعہ ایک طویل مدت کے بعد 'آسماں محراب' کے نام سے ۱۹۹۶ میں شائع ہوا۔اس میں مختلف عناوین کے تحت ۳۵ رباعیاں درج ہیں۔

فاروقی کی رباعیوں کا مطالعہ کرنے پر پتہ چلتا ہے کہ ان کی رباعیات مختلف النوع موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں۔یہ موضوعات روایتی بھی ہیں ذاتی بھی۔مضامین کی ندرت و جدت اور لہجے کی پختگی نے روایتی موضوعات کو بھی نیا بنا دیا ہے۔ان کی رباعیاں متقدمین اور متوسطین رباعی گو شعراء کی صدائے بازگشت نہ ہو کر ایک ایسی آواز کا درجہ رکھتی ہیں جو آوازوں کے ہجوم میں بھی صاف طور پر پہچانی جا سکتی ہیں۔انہوں نے موضوعات اور اسلوب کی سطح پر انیسؔ، دبیرؔ امجدؔ حیدر آبادی یا دیگر کسی بڑے رباعی گو شاعر کی نہ تقلید کی اور نہ ہی ان کا اثر قبول کیا۔ایک حمدیہ رباعی ملاحظہ ہو:

(۱)

کنجشک کو چیتے سا جگر دے دینا
گل برگ کو بجلی کا ثمر دے دینا
ہے سہل تجھے مگر ہے سب سے آساں
بے تاب دعاؤں میں اثر دے دینا

حمدیہ رباعی کی یہ آب و تاب کہیں اور نظر نہیں آتی۔عام طور سے خدا کی حمد و ثنا میں لہجے کا ٹھہراؤ پایا جاتا ہے مگر یہاں لہجے کی بلند آہنگی کو صاف طور سے سنا جا سکتا ہے۔اس رباعی میں کوئی نئی بات یا نیا نکتہ نہیں پیش کیا گیا ہے لیکن لہجے کی انفرادیت نے اسے منفرد بنا دیا ہے۔'بجلی کا ثمر' ایک نئی شعری ترکیب ہے۔بجلی جس پر گرتی ہے اسے جلا ڈالتی ہے۔یہ فعل بظاہر نقصان دہ لگتا ہے لیکن جب معمولی چیز بھی شعلہ بن جائے تو یہ فعل مثبت رجحان کو فروغ دینے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔فاروقی کے یہاں آگ، آتش اور شعلہ لفظ کا استعمال کئی رباعیوں میں ہوا ہے۔وہ معمولی سے معمولی چیز کو بھی شعلہ نوائی پر آمادہ کرنے یا شعلہ میں تبدیل ہو جانے کے خواہاں نظر آتے ہیں۔شعلہ ان کے یہاں حرارت اور انقلاب کے علامت کے طور پر سامنے آتا ہے۔ان کی رباعی جس کا پہلا مصرعہ 'ہر آگ کو نذرِ خس و خاشاک کروں' یا پھر یہ رباعی جس کا پہلا مصرعہ 'اب شعلۂ خس پوش کو آزادی دے' اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

فکر و فلسفہ کے ساتھ ساتھ فاروقی کے یہاں رومانی رباعی بھی موجود ہے۔لیکن اس رومانیت کی فضا چاندنی رات کی طرح شیتل نہیں بلکہ جنگ کے میدان کی طرح ہنگامہ خیز ہے۔وہ خارزار وادیوں سے گذر کر کوئے معشوق میں قدم رکھتے ہیں۔ایک رباعی ملاحظہ کیجیے، جو 'آسماں محراب' میں 'مسیحائے شوق' کے عنوان سے ہے۔

(۲)

خار آہن ہوں برگِ زر ہو جاؤں
سوکھی کھیتی ہوں چشمِ تر ہو جاؤں
ہلکا سا ترے پانو پہ یہ چوٹ کا داغ
میں چھو لوں اس کو تو امر ہو جاؤں

اس رباعی کے متعلق بلراج کومل لکھتے ہیں:

''''خار آہن' 'برگ زر' 'سوکھی کھیتی' 'پانو کی چوٹ کا ہلکا سا داغ' اور 'امر' ہونے کی آرزو۔یہ سب اگرچہ بظاہر غیر متعلق تفصیلات ہیں لیکن جب شمس الرحمٰن فاروقی جان ڈن John Donne کے انداز میں ان کے اندر ربط پیدا کر لیتے ہیں تو یہ رباعی وجود میں آتی ہے۔''

نامہ کتاب نما شمس الرحمٰن فاروقی (شخصیت اور ادبی خدمات) مرتب، احمد محفوظ، ماہنامہ کتاب نما، جامعہ نگر نئی دہلی، نومبر ۱۹۹۴ء ص:۸۷)

فاروقی کے یہاں اسلوب کی پیچیدگی اور خیال کی ندرت کے سبب رباعیوں کی تفہیم آسان نہیں ہوتی۔چاروں مصرعے جس بنیادی خیال سے مربوط ہوتے ہیں اس تک رسائی حاصل کرنے میں بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ان رباعیوں کی تفہیم کے لئے جہاں شاعری کا

بالیدہ ذوق اورکلاسیکی شاعری کا مطالعہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ وہیں لفظ کے معنوی امکانات سے واقفیت بھی کم اہمیت کی متقاضی نہیں۔

فاروقؔی کے یہاں ایسی رباعی بھی ملتی ہے جو زبان و بیان کے سبب اس عہد کی سیر کراتی ہے جو ولؔی دکنی اور سراؔج اورنگ آبادی سے منسوب ہے۔ مثلاً

(۳)

تجھ مہر سے روشن ہوئے ہیں راتوں رنگ
تجھ آنکھ سے برسے ہیں برساتوں رنگ
دل چیر کے میرا کبھی دیکھا ہوتا
کس طرح اچھلتا ہے لہو ساتوں رنگ

اس رباعی کے پہلے اور دوسرے مصرعے کی جو زبان ہے وہ ہمارے ذہن کو فوراً ولؔی کے اس مصرعے کی طرف لے جاتا ہے۔ ''تجھ مکھ کی پرستش میں گئی عمر مری ساری۔'' یا پھر سراؔج کا مصرعہ ''مشتاق ہوں تجھ لب کی فصاحت کا ولیکن۔'' جدید دور میں زبان کی یہ شکل مشکل سے دیکھنے کو ملتی ہے۔ اب 'تجھ لب' کی جگہ 'تیرے لب' اور 'تجھ مکھ' کی جگہ 'تیرے مکھ' بولا اور لکھا جاتا ہے۔ ایک طویل مدت تک کلاسیکی شاعری کا مطالعہ کرنے کے سبب ممکن ہے کہ زبان کا یہ روپ فاروقؔی کے لاشعور میں داخل ہوگیا ہو۔ زبان کا یہ روپ قدیم تو ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اس روپ میں جو موسیقیت اور حسن ہے وہ جدید شکل میں نہیں۔

فاروقؔی کی رباعیوں کی ایک اہم خاصیت یہ بھی ہے کہ ان کی بعض رباعیوں کے چوتھے مصرعے، بعض کے تیسرے اور کبھی کبھی پورا شعر ہی فارسی زبان میں ہوتا ہے۔ جب خیالات علمی اور فکری ریاضت کا نچوڑ اور شعری تسلسل کا نقطۂ آخر ہوں لیکن عروضی پابندیوں اور زبان کی تنگ دامنی کے سبب ضبطِ اظہار میں آنے سے قاصر ہوں تو شاعر مجبوراً کسی ایسی زبان کو اظہار کا وسیلہ بناتا ہے جس میں اظہار کی وسیع گنجائش اور شکل و شباہت میں حد درجہ کی مماثلت پائی جاتی ہے۔ غالباً یہی سبب ہے کہ فاروقؔی کی اردو رباعیوں میں بھی فارسی زبان کے مصاریع اچھی تعداد میں ملتے ہیں۔ یہ مصرعے اس ہنرمندی اور خوبصورتی کے ساتھ اردو مصاریع کے ساتھ آئے ہیں کہ ان پر پیوندکاری کا گمان بھی نہیں گذرتا۔ ایک رباعی ملاحظہ ہو:

(۴)

مٹی ہیں، ہوں گے ہی زمیں کا پیوند
پھیلے ہوئے چار سمت اصلاً پابند
ہم جڑ سے اکھاڑے ہوئے اشجار کے برگ
گلشن نہ دمد از خود یاران چہ کنند

اس کے ساتھ ہی فاروقؔی کے یہاں غیر خصی رباعیاں بھی اچھی خاصی تعداد میں ہیں۔ لیکن یہ رباعیاں وہ تاثیر نہیں رکھتی جو رباعی خصی میں پائی جاتی ہیں۔ چاروں مصرعے مقفیٰ ہونے کے سبب تجسس کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی اور برجستگی کی صفت سے بھی محروم ہو جاتی ہیں۔ جس سے ایسا لگتا ہے کہ چاروں مصرعے ایک ہی کیفیت ایک ہی سمت اور ایک ہی رفتار سے رواں ہیں۔ جس کی کوئی منزل نہیں۔ رباعی کب شروع ہوئی اور کب ختم اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ فراؔق کے یہاں بھی غیر خصی رباعیوں کی یہی حالت ہے۔ اس طرح کی رباعیوں میں ان کے مصرعوں کی ترتیب بدل دینے سے نفسِ مضمون پر بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ فاروقؔی کے یہاں ہمیں یہ تجربہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ غیر خصی رباعی کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

(۵)

ہر لذت کا منبع و مخرج ہے دل
جنگل ہے بدن، جنگل کا گج ہے دل
کج باز ہو تم صاحب تو کج ہے دل
درویشوں میں زر مروج ہے دل

فاروقؔی کی رباعیوں کے اس مختصر سے جائزے کے بعد یہ رائے قائم کی جاسکتی ہے کہ ان کی رباعیاں تفکراتی اور علمیاتی نوعیت کی ہیں۔ یہ رباعی کے فکری رجحانات کے نئے ابعاد کو روشن کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ رباعیات کے تلازمات، لفظیات، شعری تراکیب اور چوبیسوں اوزان کا استعمال، ان سب کے تناظر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ فاروقؔی کی رباعیاں انفرادیت اور قادرالکلامی کے اظہار کے جذبے کے تحت کہی گئیں ہیں۔ ان کی رباعیاں، رباعی گوئی کی روایت میں ایک اہم درجہ رکھتی ہیں۔

☆☆☆

بشریٰ اعجاز کے افسانوں میں اسلوبیاتی وموضوعاتی کائنات کا مطالعہ

ڈاکٹر محمد انور

(این ٹی ایم، سی آئی ایل، میسور، کرناٹک 570006)

۱۹۶۰ء کے بعد موضوعاتی اور اسلوبیاتی سطح پر جو نئے تجربے ہوئے اس نے کچھ اچھے افسانے کو وجود بخشا مثلاً سلوٹیں اور بازیافت (جوگیندر پال)، جس تن لاگے (رتن سنگھ)، وہ (بلراج مین را)، روشنی کے مینار (جیلانی بانو) شوکیس اور دو بھیگے ہوئے لوگ (اقبال مجید)، پوشاک (اقبال متین)، ہیڈلس بڈھا (رام لعل)، پہیہ اور پیاسی چڑیا (غیاث احمد گدی)، رونے کی آواز (سریندر پرکاش) اور پھر کچھ وقفے سے، سنہری چڑیا (سلام بن رزاق)، صورت حال (حسین الحق)، ذائقہ (شوکت حیات) کے علاوہ شفیع جاید، احمد یوسف، شفیع مشہدی، ذکیہ مشہدی، غضنفر، عبدالصمد، علی امام اور عبید قمر کے کچھ عمدہ افسانے معرضِ وجود میں آئے۔ ان افسانوں کے مطالعے سے جو موضوعات سامنے آتے ہیں ان میں (۱) تقسیم ہند اور فسادات (۲) جنس (۳) جاگیردارانہ تہذیب کا زوال اور اس کے اثرات (۴) شہری زندگی (۵) گھریلو معاشرہ اور اس کی ازدواجی زندگی (۶) دیہاتی اور کسان (۷) بھاگ دوڑ اور کامیابی کی للک (۸) پرانی اقدار کا زوال اور (۹) گھٹن اور بے بسی کا احساس وغیرہ موضوعاتی پہلو قابلِ ذکر ہیں۔ ان موضوعات کے قالب میں چند فروعی موضوعات بھی رونما ہوئے ہیں، جو ظاہر ہے قدرتی طور پر بڑے موضوعات کے لوازم قرار دئے جاسکتے ہیں۔

موضاعاتی سطح پر اردو افسانہ نویسی کے اس اجمالی جائزہ کے بعد یہ دیکھنا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ بشریٰ اعجاز کے یہاں موضوعات کے انتخاب میں کیا ندرت ہے اور انھیں دوسروں سے کن معنوں میں مختلف گردانا جاسکتا ہے۔

معاصر افسانہ نگاروں سے ممیّز اور ممتاز کرنے کے سلسلے کی دو بنیادی باتیں ہوتی ہیں (۱) اسلوب (۲) موضوع۔

اس تناظر میں بشریٰ اعجاز کے افسانوں کے جائزہ سے احساس ہوتا ہے کہ بشریٰ اعجاز اسلوبیاتی اور موضوعاتی سطح پر اپنی الگ ڈگر بنانے میں کوشاں ہیں اور یہی ان کی کامیابی کا راز ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے افسانوی مجموعہ ''بارہ آنے کی عورت'' میں اپنے موقف کا اظہار یوں کیا ہے:

> ''شروع کرتی ہوں اللہ کے نام سے
>
> جو نری محبت ہے۔ نمو ہے۔ حیات ہے اور کنارہ ہے۔
>
> بس اس کو چاہ لو باقی سب خیر ہے۔ چلو اسے بھی چاہ لیا۔ اسی کو چاہ لیا پھر؟ پھر شر ہے۔ اسی چیز کا نصف۔ اس کو بھی چاہو۔ چلو اسے بھی چاہ لیا۔ باقی پھر کیا رہ گیا۔ کچھ بھی نہیں۔ نہیں بات کچھ دل کو لگی نہیں۔ خیر اور شر کے درمیان جو ان کہا ہے۔ بے لکھا اور ان سنا نہیں۔ اس کی بات کرو۔ وہ راستہ جو تمام راستے ختم ہوجانے کے بعد شروع ہوجاتا ہے۔ اس کی بات۔ وہ بات جو آنکھوں دیکھی، کانوں سنی نہیں ہوتی مگر ہوتی ضرور ہے بلکہ اہم ہوتی ہی وہ ہے، وہ جو گونگی، بہری اور اندھی ہونے کے باوجود دکھائی، سنائی اور سجھائی

دے۔ وہ لکھو، وہ کہو، چلیں کہہ دی۔ لکھ دی۔ مگر پڑھے گا؟ سنے گا کون؟ اس کی فکر چھوڑو۔ آج نہیں تو کل سنی جائے گی۔ آج نہیں تو کل پڑھی جائے گی۔ وہ زیادہ اچھا ہوگا۔ کرو وہ بات جو آج کی نہیں کل کی ہو۔ اس لئے کہ کل نے آج ہونا ہے کبھی نہ کبھی۔'' (1)

بشریٰ اعجاز کی افسانہ نگاری کی تفہیم کیلئے لازمی ہے کہ براہ راست ان کے افسانوں کا رخ کیا جائے تاکہ تجزیاتی روشنی میں ان پر کوئی صحیح رائے قائم کی جاسکے۔

بارہ آنے کی عورت:

'بارہ آنے کی عورت' بشریٰ اعجاز کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ جو ۱۹۹۴ء میں سنگ میل پبلی کیشنز لاہور سے شائع ہوا، اس مجموعے کے بیشتر افسانے اس سے قبل دیگر رسائل وجرائد میں شائع ہو چکے تھے۔ اس کے متعدد افسانے کے بشریٰ کے ذاتی وقلبی وارداتوں پر مبنی ہیں۔ '' چراغ اور کٹیا'' ماں کی وفات پر مبنی محسوسات کا بیان ہے۔ 'حاجی سلطان احمد کی لاڈلی بشریٰ کی والدہ اور نانا جی کی آپ بیتی ہے، اس افسانے میں حاجی سلطان احمد گاؤں میاں ہزارے سے تعلق رکھتے ہیں اور بی بی حیات کی اکلوتی اولاد تھی، جو کہ افسانے میں بھی لاڈلی اور حاتاں کے نام سے جانی جاتی ہیں۔

بشری اعجاز نے اپنے افسانوں میں جن مسائل کو پیش کیا ہے ان کا تعلق خواتین سے ہے، جو زیادہ تر سماجی رشتوں کے دائرے میں گردش کرتے ہیں۔ جن میں عورت ماں، بیٹی، بہن اور بیوی وغیرہ کے روپ میں سامنے آتی ہے۔

کی ''فیری لینڈ'' 'بارہ آنے کی عورت' کا پہلا افسانہ ہے۔ افسانے کا عنوان ہی اپنے اندر مختلف معنیٰ سمیٹے ہوئے ہے افسانہ نگار کے موقف کی وضاحت کرتا نظر آتا ہے۔ اس افسانے میں بشریٰ اعجاز نے فوزیہ احمد اور زہرہ علی کے کردار کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے اپنی اپنی سطح پر یہ دونوں کردار مرکزی حیثیت کے حامل ہیں۔

اس افسانے میں خاندانی پس منظر کی وضاحت بھی ہے اور شہری زندگی کا عکس بھی۔ اس سارے مراحل میں گھٹن اور حبس کی کیفیت درجۂ کمال کو پہنچتی ہے۔ آج کی زندگی کا یہ بڑا المیہ ہے کہ کوئی بھی شخص اپنے آپ اور اپنے حالات سے مطمئن نہیں ہے۔ گرد و پیش پھیلی زندگی اور حالات کا خلاصہ افسانہ میں کچھ یوں رقم ہوا ہے۔

''اف زندگی کتنی بیزار ہے۔ اس نے اپنے اردگرد نگاہ دوڑاتے ہوئے سوچا میں آخر کیا کرتی پھر رہی ہوں یہاں؟ یہ سالخوردہ بے لباس کتابیں جن کی مدد سے میں تحقیق کے میدان میں جھنڈے گاڑنے کی فکر میں ہوں۔ کتنی لاچار نظر آرہی ہیں، بالکل مری ہوئی چھپکلیوں کی طرح۔ یہ مچھر، یہ حبس، آخر یہ سب کیا ہے؟ اس نے ساتھ والی ڈھیلی نواڑ کے پلنگ پر بے ترتیبی سے بکھری ہوئی فوزیہ احمد پر نظر ڈالی جو اپنے سیاہ ٹوکرے جیسے بال تکیے پر پھیلائے بڑے مزے سے سو رہی تھی۔'' (2)

ایک اور اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''ہم لوگ بھی کتنے بے وقعت ہیں۔ کتنی جناح لائبریریاں ہم سے بھری ہیں کتنے شعبہ علم ہماری موجودگی میں حبس و گھٹن کا شکار ہیں۔ علم جو علم کو گٹھریوں کی طرح سر پر اٹھائے ہانپ رہے ہیں۔ مارے پیاس کے زبانیں تالو سے چمٹ رہی ہیں۔ ایک بوند، صرف ایک بوند، مگر کون پلائے؟ کسے فرصت ہے! آموں کے باغ میں برہا کی ماری کوئل کوکتی ہے پی. ہا، پی. ہا۔ آموں کے چھتنار درختوں پر ہلکا ہلکا سنہری مائل پیلا پیلا بور لگ لگ کر جھڑتا رہتا ہے۔'' (3)

فلسفۂ زیست کی عقدہ کشائی کرتا یہ افسانہ بشریٰ اعجاز کی فکر کی نمائندگی کرتا ہے۔ تصنع آمیز زندگی سے دور یہ فطرت کی سادگی اور اس زندگی کی تلاش کی سعی ہے جو حقائق کی بنیاد پر استوار ہوتی ہے۔ اس افسانے سے متعلق ڈاکٹر روبینہ شبنم لکھتی ہیں:

''افسانہ فیری لینڈ بشریٰ اعجاز کا شاہکار افسانہ ہے جس میں انہوں نے زہرا علیٰ کا ایسا کردار پیش کیا ہے جو فلسفۂ زندگی پر نئی تحقیق کرنا چاہتی ہے۔ اس کی سوچ، اس کی فکر اسے دو زمانوں کے درمیان اس طرح معلق کر دیتے ہیں کہ وہ جال میں رہتے ہوئے کبھی ماضی میں ڈوب جاتی ہے اور کبھی ماضی سے نکل کر حال کی تلخیوں میں اپنے آپ کو بری طرح پھنسی ہوئی محسوس کرتی ہے۔ وہ اپنی ساتھی فوزیہ احمد سے جب کبھی گفتگو کرتی ہے تو اسے ماضی کی سنہری روایات اور شہر کی تصنع آمیز زندگی سے آزاد انسان

فطری زندگی بار بار یاد آتی ہے۔ وہ بنیادی طور پر فطرت پرست ہے اور فطرت سے پیار کرنا جانتی ہے۔ اسے اس بات کی شکایت ہے کہ زندگی کے بارے میں جو بھی فلسفے لکھے گئے ہیں وہ کتابوں میں بند ہیں اور اب جدید نسل بار برداری کے جانور بن کر اس بوجھ کو ڈھو رہے ہیں۔ زہرا علی کو اکثر اپنا فیری لینڈ یاد آتا ہے جہاں صبحیں فطرت کے حسین مناظر دکھاتی تھیں۔ جہاں بچے چٹائیوں پر بیٹھے، رحل کے اوپر سپارے رکھتے تھے۔ تحصیل عمل کی طرف پہلا قدم بڑھاتے تھے، جس کے لئے نہ ایڈمیشن مینس تھی، نہ سیکوریٹی، سر پر بڑا سا ململ کا دوپٹہ ہاتھوں میں الف بے کا قاعدہ بس یہی کچھ علم کی بنیاد تھی جہاں سے سب سے پہلے الف سے اللہ پڑھایا جاتا تھا پھر اس کے بعد انسانی زندگی میں جو کچھ تبدیلیاں آتی گئیں اور علم جس انداز سے ترقی کرتا گیا اس کو بشریٰ اعجاز نے جس انتہائی خوبصورت انداز میں پیش کیا وہ قابل داد ہے۔'' (4)

بشریٰ اعجاز کے یہاں جو موضوعاتی انتخاب اور اسلوبیاتی ندرت پائی جاتی ہے اس کا ایک نمونہ زیر تجزیہ افسانے کے اس اقتباس میں ملاحظہ کیجئے جو زوال پذیر معاشرے کی عکاسی پر مبنی ہے۔

''علم بڑھتا گیا الف سکڑتا گیا، سمٹتا گیا، نقطہ بنتا گیا یہاں تک کہ ایک دن وہ غائب ہوگیا۔ ماڈل ٹاؤن کی بے رونق، بوسیدہ کوٹھی کی اوپری منزل کے کمرے تک پہنچتے پہنچتے اس کا سانس پھول گیا وہ نڈھال ہوگیا۔ تھک گیا بے چارا۔ ہاں فلسفۂ حیات تازہ دم تھا۔ پر اعتماد، چاق و چوبند تھا۔ ڈھیر بڑا ہوتا گیا۔ بڑھتا گیا، یہاں تک کہ وہ اس یرقان زدہ کمرے میں آکٹوپس کی طرح پھیل گیا۔ زہرہ علی نے سہمی سہمی نظروں سے اس ڈھیر کے نیچے دبے اپنے بے مایہ وجود کو دیکھا کہا الف اللہ، اک کوندہ سا لپکا۔'' (5)

اس افسانہ کا ایک توانا کردار فوزیہ احمد کی صورت میں پیش کیا گیا ہے جو سول سروس کے امتحان کی تیاری کر رہی ہے۔ اس کا مقصد زندگی کی دوڑ میں اعلیٰ مقام اور دنیا کی تمام آسائشیں حاصل کرنا ہے۔ بالآخر فوزیہ احمد سول سروسز اکیڈمی جوائن کر لیتی ہے اور ایک دن زہرہ علی کو اپنی شادی کی خوش خبری بھی دیتی ہے لیکن زہرہ علی کو اس خبر سے کوئی مسرت نہیں ہوتی۔ یہ 'فیری لینڈ' کا یہ منظر ملاحظہ کیجئے:

''جس دن جناح لائبریری کے پرسکون ماحول میں فوزیہ احمد نے اسے اپنی شادی کی خبر سنائی اس دن بنگال میں سیلاب کی وجہ سے ہزاروں لوگوں کے لقمۂ اجل اور بے گھر ہونے کی خبر اس نے کچھ ہی دیر پہلے اخبار میں پڑھی تھی وہ آنکھیں کھولے مسلسل ان دونوں خبروں کے درمیان باہمی ربط پر غور کرتے ہوئے مسرور بیٹھی فوزیہ احمد کو احمقوں کی طرح تکے جا رہی تھی۔ نہ جانے کیوں اسے ان دونوں خبروں کے درمیان باہمی ربط کا گمان ہو رہا تھا۔'' (6)

زہرا علی کی یہ فکر اس وقت حقیقت کا جامہ پہن لیتی ہے جب وہ یہ افسوسناک خبر سنتی ہے کہ فوزیہ احمد کی اپنے اسسٹنٹ کمشنر شوہر سے نہیں بنی اور شدید ڈپریشن میں اس نے خواب آور گولیاں کھالیں جو اس کی موت کا سبب بنیں یعنی فوزیہ احمد کو خودکشی کرنی پڑی۔

اس افسانے میں زہرا علی کے کردار کو تذبذب کا شکار دکھایا گیا ہے جو اپنے آپ کو ایسے مقام پر پاتا ہے جہاں صحیح فیصلہ کرنا مشکل نظر آتا ہے۔ اس سیاق میں زہرا علی کی ماں کا یہ جملہ معنویت سے خالی نہیں۔

''بیٹا! اب تو میں سوچتی ہوں تمہیں ناحق اتنا پڑھایا، قاعدے، قرآن اور پکی روٹی کا سبق دلوانے کے بعد تمہاری شادی کر دیتی تو اچھا تھا۔'' (7)

اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ انسان کے اندر اگر دینی عقائد کا فقدان ہو جائے تو اس کی زندگی میں ایک روحانی خلا کا پیدا ہو جانا یقینی ہے۔ دین و دنیا کا باہمی ربط ہی انسانیت کی معراج ہے۔ لیکن فی زمانہ دنیا زندگی پر زیادہ حاوی ہوگئی اور اس کی وجہ کر جو کچھ ہو رہا ہے وہ ڈھکی چھپی بات نہیں۔ دور جدید میں علم بظاہر اپنی انتہا کو پہنچتا نظر آتا ہے لیکن سچی بات یہ ہے کہ علم نے آج انسان کو ایک ایسے مقام پر لا کھڑا کیا ہے جہاں لامذہبیت کی عفریت اسے نگل لینا چاہتی ہے۔ اس افسانے میں بشریٰ اعجاز نے دراصل زہرا علی اور فوزیہ احمد کے کرداروں کو پیش کر کے فلسفۂ حیات کے دونوں پہلوؤں پر نہ صرف روشنی ڈالی ہے بلکہ اس کے نتائج سے بھی روشناس کرانے کی کوشش کی ہے۔

بشریٰ اعجاز کا افسانہ ''دل اور دائرہ'' محبت کا نیا رُخ پیش کرتا ہے۔ یہ دراصل ایک ادھوری عورت کی کہانی ہے جس کے مثلث کردار میں صبیحہ، آصف اور بشارت علی قابلِ ذکر ہیں۔ آصف صبیحہ کا شوہر ہے اور بشارت

علی صبیحہ کے کالج کا کلاس فیلو۔ بشارت علی کی ا مریکی بیوی اپنے پانچ سال بچے کو چھوڑ کر امریکہ واپس چلی جاتی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ بشارت علی اور صبیحہ جب کالج میں زیر تعلیم تھے تو بشارت علی کی پرکشش شخصیت نے صبیحہ کے دل میں محبت کی چنگاری جلا دی تھی۔ لیکن صبیحہ تمام تر توجہ کے بعد اظہار محبت سے گریز کرتی رہی تھی۔ ایک دن یہ ہوا کہ صبیحہ اپنی نوٹ بک ڈیسک میں بھول گئی دوسرے روز نوٹ بک سے بشارت علی کی تحریر میں ایک پرزہ برآمد ہوا۔ عبارت کچھ یوں تھی۔

''دائرے میں آنکھیں بند کر کے گھومنے کی عادت اچھی ہے مگر اتنا تو بتا دیجئے مرکز کون ہے۔''(8)

اس واقعے کے ایک ماہ بعد صبیحہ آصف سے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوگئی اور اس طرح زندگی پرسکون انداز میں گامزن ہوگئی۔ آصف نے اپنی بیوی بچوں کے ساتھ خوشحال زندگی کا سفر شروع کر دیا۔ لیکن وقت کی ستم ظریفی کو کیا کہئے۔ صبیحہ کی زندگی میں اچانک ایک بار پھر بشارت نے دستک دی، صبیحہ اور بشارت کی یہ ملاقات جذبات کی انتہا کو پیش کرتی ہے۔ اس ملاقات میں صبیحہ نے بڑی بے تکلفی سے بشارت علی کو کالج کی تمام باتیں سنائیں اور گھر آنے کا وعدہ بھی لے لیا۔ اپنے شوہر آصف سے بشارت علی کا غائبانہ تعارف کرایا۔ بشارت علی کی خوشی مزاجی اور آصف کی نرم خوفطرت کی بدولت دونوں میں دوستی ہوگئی اور اس طرح بشارت علی کا آنا جانا شروع ہو جاتا ہے۔

بشارت علی کی آمد سے صبیحہ کے گھر میں سلیقہ مندی اور رکھ رکھاؤ آجاتا ہے۔ جبکہ بشارت علی کے اپنی زمین کے سلسلے میں مہینہ بھر گاؤں چلے جانے سے گھر میں بکھراؤ کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ آہستہ آہستہ صبیحہ اور آصف کی زندگی بھی متاثر ہونے لگتی ہے۔ اس تبدیلی سے آصف یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ صبیحہ اور بشارت علی صرف سابق کلاس فیلو ہیں یا کچھ اور بھی۔ ایک روز باتوں باتوں میں بشارت علی صبیحہ سے یہ جاننا چاہتا کیا وہ بھی اس کے لئے بے چین رہتی ہے اور اس سے محبت کرتی ہے۔ لیکن صبیحہ کو یہ گوارہ نہیں۔ اس نے اپنے گھر کو گھر بنائے رکھنے پر اکتفا کیا اور ایک دن واضح طور پر بشارت علی کو یہ کہہ دیا کہ ''بشارت علی آئندہ یہاں آنے کی کوشش نہ کیجئے گا۔''(9)

بشارت علی کی ساری کوششیں رائیگاں ہوگئیں، صبیحہ نے اپنی صالحیت کو بچائے رکھا۔ خود کلامی کے انداز میں صبیحہ کی یہ گفتگو افسانہ نگار کی فکری صالحیت کا اعلامیہ ہے۔

''بشارت علی تم نے پہلے بھی مجھے دائرے میں گھومنے سے روکنے کی کوشش کی تھی اب عملی طور پر تم اس میں کامیاب ہو چکے ہو۔ میں اب دائرے میں رہتے ہوئے بھی اپنے مرکز سے کٹ چکی ہوں۔ میرا ایک قدم دائرے میں تو ایک قدم باہر پڑتا ہے مگر میں مرکز سے کٹ کر بھی دائرے سے باہر نہیں جا سکتی کہ مجھے دائرے سے باہر چلنا آتا ہی نہیں۔'' (10)

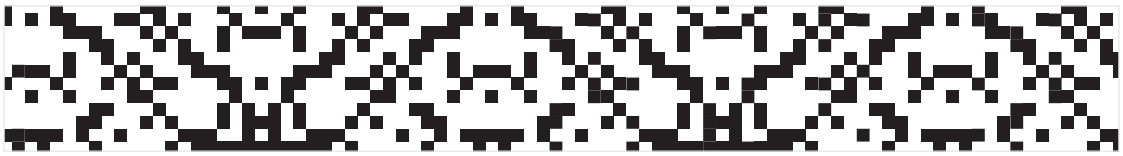
اس افسانے میں صبیحہ کا مرکزی کردار متواتر تبدیلی کی زد میں ہے تاہم فکری صالحیت کا محوری نکتہ افسانہ نگار کے دسترس سے باہر نہیں۔ غالباً فکری سلامتی اور خانگی زندگی کا تحفظ ہی اس افسانہ کا مدعا ہے۔

''کہانی اپنے کلائمکس پر اس وقت پہنچتی ہے جب تصادم اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے اور تبھی مرکزی کردار کی قسمت یا اس قسمت سے متعلق اس کے رویے میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ یعنی جو وہ چاہتا ہے ممکن ہے اسے مل جائے لیکن تب بھی وہ مطمئن نہیں ہو پاتا کیونکہ وہ یہ سوچتا ہے کہ حقیقتاً اس نے یہ نہیں چاہا تھا۔ یا کم از کم اس صورت میں ہرگز نہیں چاہا تھا۔ مکمل معکوسیت ہو چاہے نہ ہو لیکن کلائمکس کا عمل ایک فیصلہ کن صورتحال کی طرف بڑھتا ہے جسے سلجھاؤ کہہ سکتے ہیں یہاں پہنچ کر تمام الجھنیں اور کشمکش ختم ہو جاتی ہیں جن سے پلاٹ کا تانا بانا بنا گیا تھا اور واقعات واضح صورت میں سامنے آجاتے ہیں۔ جن میں کوئی الجھاؤ باقی نہیں رہتا۔'' (11)

حواشی:

1۔ افکار و مسائل، احتشام حسین، ص:۱۷
2۔ بارہ آنے کی عورت، بشریٰ اعجاز، ص:۹
3۔ ایضاً، ص:۱۲
4۔ بشریٰ اعجاز کے افسانوں کا تنقیدی جائزہ، ڈاکٹر روبینہ شبنم، ص:۳۷
5۔ بارہ آنے کی عورت، بشریٰ اعجاز، ص:۱۵
6۔ ایضاً، ص:۲۰
7۔ ایضاً، ص:۱۹
8۔ ایضاً، ص:۲۴
9۔ ایضاً، ص:۲۸
10۔ بشریٰ اعجاز کے افسانوں کا تنقیدی جائزہ، ڈاکٹر روبینہ شبنم، ص:۴۴
11۔ ایضاً، ص:۷۸

☆☆



احمد فرازؔ: اردو غزل کا عہد آفریں شاعر

خلیق الزماں نصرت

(ممبئی Mob: 9923257606)

آگ سے بھرے ہوئے راستے اور آتش بار فضاؤں میں دہکتے ہوئے ماحول سے گذرتے ہوئے کسی سرسبز و شاداب نخلستان، سبزہ زار یا مرغ زار میں اچانک پہنچ جانے کے بعد جس فرحت اور تازگی کا احساس ہوتا ہے، وہی احساس اس وقت ہوتا ہے، جب اردو غزل کے صدیوں کے پامال موضوعات میں کوئی نئی اور چونکا دینے والی آواز سنائی دینے لگے۔ اردو کی روایتی کلاسیکی غزل صدیوں ہجر و فراق کے مضامین سے بھری جاتی رہی ہے۔ یہاں تک کہ مبالغہ ساری حدود و قیود توڑ کر آسمانوں کی خبر لانے لگا تھا۔ ایک کلاسیکی شاعر نے ہجر کے بارے میں کہا تھا ؎

اک روز، ان کے ہجر میں رویا میں اس قدر
چوتھے فلک پہ پہنچا ہے پانی کمر کمر

چوتھا آسمان وہ مقام ہے جہاں مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰؑ زندہ بلائے گئے ہیں۔ شاعر کے ہجر کے آنسو اس چوتھے فلک پہ پہنچ کر حضرت کو بھی مشکل میں ڈال دیتے تھے، لیکن اس پوری روایت میں اچانک کہیں، اس کے برعکس کوئی شاعرانہ آواز اس طرح سنائی دے ؎

رنجش ہی سہی، دل ہی دکھانے کے لیے آ
آ، پھر سے مجھے چھوڑ کے جانے کے لیے آ

تو یقیناً پڑھنے والوں کو تازگی، فرحت اور انوکھے پن کا احساس ہوگا۔ یہ احمد فراز کی شاعری کا وہ انداز اور آہنگ ہے، جو اچانک نئے پن کا احساس دلاتا ہے اور جب لاچاری مجبوری اور فراق کا احساس فزوں سے فزوں تر ہو جائے تو ایک کلاسک شاعر کی دعا ؎

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجر یار کی
آخر تو دشمنی ہے دعا کو اثر کے ساتھ

شعر کے بین السطور سے یہ خواہش اُبھرتی ہے، کاش! ہجر کی اس دعا کے ساتھ بھی اثر کی دشمنی ہو جائے اور ''ان'' کا وصالِ مستقل حاصل ہو جائے۔ لیکن جب کسی شاعر سے آپ پورے سچ کی برہنگی کے ساتھ یہ دو مصرعے سنتے ہیں ؎

ہمیشہ کے لیے مجھ سے بچھڑ جا
یہ منظر بارہا دیکھا نہ جائے

احمد فرازؔ کے اس شعر میں بھی وصالِ مستقل کی وہی تڑپ موجود ہے لیکن اظہار کی سفاکی اور بے باکی نے اس شعر کی تاثیر اور اثریت کو کلاسیکی شعر کی اثریت سے کافی جدا کر دیا ہے۔

احمد فرازؔ کا تعلق برصغیر کے جس خطے سے ہے، وہ خطہ لگاتار اور مسلسل جذباتی اور آتشیں تحریکوں کی جولاں گاہ رہا ہے اور اسی سرزمین سے اختر شیرانی جیسا شاعر بھی ابھرا ہے جس نے اردو شاعری کی محبوبہ کو نام دینے کی جرأت دکھائی ہے۔ سلمیٰ، ثریا یا جو بھی ہو، اس نے گمنام، بے نام محبوبہ کے نام کی شاعری کے مقابلے میں ناموں کی شاعری کی ہے۔ فیض احمد فیضؔ اسی خطے کی دین ہیں اور اسی خطے سے احمد فراز غزل گاتے ہوئے نکلے ہیں۔ احمد فراز کی شاعری، اگرچہ اردو غزل کے سلسلے کی ہی ایک کڑی ہے۔ لیکن عصری جذبات و محسوسات نے اس کے اسلوب بیان میں جدت اور تازگی کے جوہر پیوست کر دیئے ہیں اور لگتا ہے کہ احمد فراز کی شاعری سابقہ ماضی کی روایتی غزل کی بازگشت نہیں، بلکہ اردو غزل میں ایک حسین اضافہ ہے۔ الفاظ و بیان کے اعتبار سے بھی، مضامین اور معاملات میں بھی احمد فراز کی شاعری اپنے اندر انفرادی وصف رکھتی ہے، جسے پڑھنے والا بادی النظر میں ہی اپنی فکری گرفت میں لے لیتا ہے۔ خودستائی اور خود پرستی کی بات نہیں، لیکن عرفانِ خودی اور عرفانِ ذات کی حامل اگر کوئی شاعری سامنے آتی ہے تو بے ساختہ اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔ مثال کے طور پر احمد فراز کا یہ مقطع ؎

فرازؔ اپنے سوا ہے کون تیرا
تجھے، تجھ سے جدا دیکھا نہ جائے

مذکورہ بالا شعر خود شاعر کا اپنی شاعری پر، اپنے آپ پر اپنی فکر پر خود ایک تبصرہ ہے۔ اردو غزل صدیوں سے بہت محدود کینوس پر اپنے موئے قلم کی منظر کشی کرتی چلی آئی ہے جو روایتی اور کلاسکس بن گئی ہے۔ دراصل کسی بھی فن کی روایتوں سے الگ ہٹ کر نئی روایتوں کی طرح ڈالنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لیے غیر معمولی صلاحیت، تخلیقی توانائی اور بے پناہ مطالعہ کی ضرورت ہے۔ احمد فرازؔ کی شاعری میں تجدید و تخلیق کا یہ انوکھا امتزاج پایا جاتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے ؎

دل بھی بجھا ہو شام کی پرچھائیاں بھی ہوں
مر جائیے جو ایسے میں تنہائیاں بھی ہوں

محاکات، منظر کے ساتھ ساتھ معنیٰ آفرینی کا یہ وہ جوہر ہے جو آپ ہی آپ سننے والے کے دل پر اثر کرتا ہے اور اس کے اندر بھی افسردگی اور درد کی وہ لہر پیدا ہو جاتی ہے جس درد کی لہر نیمذکورہ شعر کہنے پر احمد فرازؔ کو مجبور کر دیا تھا۔ احمد فرازؔ کو ''حسن سادہ لوح'' متاثر نہیں کرتا بلکہ وہ مزاجِ یار میں گہرائیوں کی تلاش بھی کرتے ہیں۔ اسی لیے واشگاف، مگر غزل کے دھیمے لہجے میں کہتے ہیں ؎

ہر حسن سادہ لوح نہ دل میں اتر سکا
کچھ تو مزاجِ یار میں گہرائیاں بھی ہوں

اپنی شاعری اور اپنے شاعرانہ مقام و مرتبے کے بارے میں خود کہتے ہیں۔

میں کہ شاعر تھا، مرے فن کی روایت تھی یہی
مجھ کو اک پھول نظر آئے تو گلزار کہوں

مسکراتی ہوئی ہر آنکھ کو قاتل جانوں
ہر نگاہِ غلط انداز کو تلوار کہوں

میری فطرت تھی، کہ میں حسنِ بیاں کی خاطر
ہر حسیں لفظ کو، درمدحِ رُخ یار کہوں

ان اشعار میں احمد فرازؔ نے اردو کی اصل کلاسیکی اور روایتی شاعری کے بارے میں بڑی خوبی اور فنکاری سے ذکر کرتے ہوئے، ان کے بین السطور سے دوسرے معنیٰ یہ دیئے ہیں کہ اس کے باوجود کہ میں نے قصیدہ، مبالغہ اور آنکھوں اور سراپا کی شاعری نہیں کی ہے، اپنی شاعری کو ایک اور روپ دیا ہے۔ وہ روپ خود انہی کے لفظوں میں اس طرح ہے ؎

مرے دل میں بھی کھلے ہیں، تری چاہت کے کنول
ایسی چاہت کہ جو وحشی ہو تو کیا کیا نہ کرے

احمد فرازؔ اپنی چاہت کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ وحشی نہیں ہے بلکہ اس میں خلاقی ہے۔ شمعیں جلانے کی صلاحیت ہے۔ شاید اسی لیے وہ کہتے ہیں ؎

کیا یہ کم ہے کہ ترے حسن کی رعنائی سے
میں نے وہ شمعیں جلائی ہیں کہ مہتاب نثار
تیرے پیمانِ وفا سے مرے فن نے سیکھی
وہ دل آویز صداقت کہ کئی خواب نثار

تیرے غم نے مرے وجدان کو بخشی وہ کسک
مرے دشمن، مرے قاتل، مرے احباب نثار
یہی نہیں، مزید ملاحظہ فرمائیے۔
میں کسی غم میں بھی رویا ہوں تو میں نے دیکھا
تیرے دکھ سے کوئی مجروح نہیں تیرے سوا

میرے پیکر میں تری ذات کھلی ہے اتنی
کہ مرا جسم مری روح نہیں تیرے سوا

میرا موضوعِ سخن تو ہو کہ ساری دنیا
درحقیقت کوئی ممدوح نہیں تیرے سوا

اِن اشعار سے احمد فرازؔ کی شاعری، اس کی غزل اور اس کے فن کے بارے میں خود ان کے اپنے نظریات واضح ہوتے ہیں۔ دراصل احمد فرازؔ کی شاعری میں بھی اردو شاعری، اردو غزل کا وہی محبوب موجود ہے، جس نے اردو غزل کو دنیا کی تمام شاعری میں ممتاز اور انوکھا بنادیا ہے۔ سجملہ اصناف میں اردو غزل کے دو مصرعوں میں وہ وسعت اور سمائی ہے کہ اس میں دنیا جہان کے مسائل پیش کئے جاسکتے ہیں۔ بقول احمد فرازؔ ؎

میرا موضوعِ سخن تو ہو کہ ساری دنیا
درحقیقت کوئی ممدوح نہیں تیرے سوا

درحقیقت یہ شاعری ایک ہی ممدوح کے گرد طواف کرتی ہے اور اسی کے پردے میں دنیا جہان کے فلسفوں، نظریات، تہذیبی سرگرمیوں، سماجی تال میل، سیاسی اتھل پتھل، اخلاقی قدروں اور انسانی رشتوں کی پہچان اور اس کی شکست و ریخت کا اظہار کرتی ہے۔ احمد فرازؔ کے یہاں بیان اور زبان کا انوکھا استعمال پایا جاتا ہے جو انہیں غزل گویوں میں ممتاز کرتا ہے ؎

تمہارے بام سے اب کم نہیں ہے رفعت دار
جو دیکھنا ہو تو دیکھو نظر اُٹھا کے مجھے

احمد فرازؔ کی غزلوں میں عصری جذبات ومحسوسات کی بوقلمونی، اور اظہار کے شگفتہ انداز بیانیہ میں افسانہ اور قصہ کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ اپنے ''اُس'' سے خطاب کرتے ہوئے اردو غزل کے ایک پامال موضوع اور انگریزی ادب کے مقولے کے مطابق شاعری اور غریبی کا ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ (Poetry & Poverty go hand to hand) کہتے ہیں ؎

فرازؔ تو نے اسے مشکلوں میں ڈال دیا
زمانہ صاحبِ زر، اور صرف شاعر تو

احمد فرازؔ نے زمانہ کی صفت صاحبِ زر بیان کی ہے۔ غالباً اس کے اندر زر نواز یا زر پرست کا مفہوم پوشیدہ ہے۔ یعنی زمانہ زر پرست (صاحب زر) ہے اور تو ''شاعر'' ہے اور شاعر کی صفت معلوم ہے۔ اس لیے اس کے روبرو خود کو ''شاعر'' کہہ کر اسے مشکلوں میں ڈال دیا ہے۔

غزل میں اگر غزل کے محبوب کے علاوہ اقدار کی باتیں بھی بیان کی جائیں تو وہ غزل ہی ہوتی ہے اور فراقؔ گورکھپوری کا یہ خیال پادر ہوا ثابت ہوتا ہے کہ ؎

خشک اعمال کے اوسر میں اگا کب اخلاق
یہ تنک مایۂ دریائے معاصی ہے فراقؔ

احمد فرازؔ نے اس خشکی میں بھی غزل کی رعنائی اور جمال اس طرح پیدا کردیا ہے ؎

کہاں سے لائیں، اب آنکھیں اسے کہ رکھتا تھا
عداوتوں میں بھی اندازِ مخلصانہ وہ

عداوتوں میں ''اندازِ مخلصانہ'' کہہ کر غزل میں ایک نیا حسن اور نکھار اور معنیٰ آفرینی احمد فرازؔ ہی کا حصہ ہے۔ نئی عصری غزل میں عصری مضامین کے علاوہ تہہ داری کا جو عنصر شامل ہوا ہے اس نے اردو غزل کی ارضیت میں شانِ محبوبی پیدا کردی ہے۔ احمد فرازؔ کے یہاں اس کی بہت ساری مثالیں موجود ہیں، جیسے ؎

بدن میں آگ ہے، چہرہ گلاب جیسا ہے
کہ زہرِ غم کا نشہ بھی شراب جیسا ہے

بدن کی آگ اور چہرے کے گلاب سے زہرِ غم کی کشید اور اس میں شراب کے جیسے نشہ کی دریافت ایک اضافہ کے علاوہ کئی معنوی تہہ داری کا بھی حامل ہے۔ یہ غزل یکے بعد دیگرے اسی قسم کے تہہ دار اشعار سے بھری ہوئی ہے۔

☆☆

خالد جاوید کا ناول ''ایک خنجر پانی میں'': مطالعے کی میز پر

غلام علی اخضر

(بارسوئی، کٹیہار، بہار Mob:7275469896)

ادب کی زرخیز اور بنجر زمین پر زندگی، ہجر و وصال اور عشق و محبت یا اس طرح کے اور موضوعات پر قلم اٹھانے والوں کی ایک لمبی قطار ہے لیکن موت کو کم ہی فنکاروں نے خاص کر اردو ادب میں اسے اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا۔ ناول کے حوالے سے ایک غلط فہمی بہت عام ہے کہ ناول وقت گزاری کا بہترین ذریعہ ہے۔ مگر ناول 'ایک خنجر پانی میں' نے وقت گزاری والے خیال اور سوچ کو بالکل باطل کر دیا ہے۔ یہ ناول جہاں سماج، سرکاری سسٹم کی کج روی کو درشاتا ہے وہیں علمی، تاریخی، طبی شعبہ جات سے بھی واقف کراتا ہے۔ ناول کے نام سے ہی ظاہر ہے کہ مصنف نے پانی کو موضوع بنایا ہے۔ اب چوں کہ پانی کے ارد گرد انسان کی زندگی رقص کرتی ہے، اس کے بغیر اس کی زندگی بے سروساماں اور یتیم و لاچار ہے۔ جسم میں پانی کم ہو جائے تو وہ انسان کی موت کا سبب بن سکتا ہے۔ ایسے ہی دنیا کے دوسرے معاملات میں بھی ہے۔

مصنف نے جن اپارٹمنٹس کو اپنے ناول میں ایک سمبل کے طور پر استعمال کر کے حقیقت بیانی کی ہے وہ ایک دوسرے کے مدمقابل نام ہے، یعنی لائف اپارٹمنٹ، موت کی ضد۔ گندگی سے سارا علاقہ بدبودار ہے تو گلاب اپارٹمنٹ میں خوشبو کیوں نہیں جب کہ گلاب کا تاثر بدبو کی ضد ہے۔ اسی طرح جنت اپارٹمنٹ۔ ہر طرف وبا سے ہاہا کار مچا ہے لیکن اس میں بھی ایک شاعر تخیل کی دنیا میں مست ہے۔ لائف اپارٹمنٹس میں زہر آلود سپلائی پانی آنے کی وجہ سے لوگ مہلک بیماری کا شکار ہو جاتے ہیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ بیماری ارد گرد پیر پسارنا شروع کر دیتی ہے۔

مصنف نے ابتدا میں ہی یہ بات رقم کر دی ہے کہ یہ ناول ان کی موت کی تیسری کتاب ہے۔ اس ناول کو اگر چہ آسان الفاظ کے ساتھ پرو دیا گیا ہے مگر بعض جگہوں پر جملے کے اختتام ہوتے ہوتے وہ مفہوم کی جٹیل سمی کرنوں میں پیوست ہو کر رہ جاتا ہے۔ ایسا ہی مصنف کے دوسرے ناولوں میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ ناول پڑھنے سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ منصف کئی علوم و فنون کے حسین سنگم ہیں جس کا عکس و رنگ ناول میں بحسن و خوبی آشکارا ہے- پانی کے ساتھ جڑے مختلف مذاہب کے مختلف عقائد ناول میں ہمیں مل جاتے ہیں۔ جیسے کہ ہندو مذہب میں یہ عقیدہ ہے کہ گنگا اسنان کرنے سے سارے پاپ دھل جاتے ہیں- ناول ان علاقوں کا بھی عکاس ہے جن علاقوں میں پانی نہ ہونے کی وجہ سے سرکاری ٹینکر پہنچتے ہیں، پھر کیا افراتفری کا عالم بپا ہوتا ہے، اور کیسے پانی کی دنیا میں کالا بازاری ہوتی ہے وغیرہ۔ دنیا ایک معمہ ہے۔ ظاہر ہے دنیا میں زندگیاں بستی ہیں اور زندگی ایک معمہ ہے جسے نہ سمجھا جا سکتا ہے اور نہ سمجھایا جا سکتا ہے۔ اس کی ترجمانی شاعر نے یوں کی ہے۔

زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا
ایک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا (فانی)

وبائیں کس طرح ہماری زندگی کے حرکت و عمل میں مخل ہو کر بری طرح سے متاثر کرتی ہیں۔ اس حوالے سے تحریک خلافت کے دوران گاندھی جی کو اسپنی فلو ہونے کے وجہ سے سرگرمی سرد پڑنے لگی تھی، ناول میں اچھی دلیل ہے اور تاریخی بھی۔ اقتباس ملاحظہ کریں:

''.....تحریک خلافت کے دوران مہاتما گاندھی کو بھی اسپنی فلیو [فلو] ہو گیا تھا جس کے سبب یہ تحریک وقت سے پہلے ہی کچھ کمزور پڑ گئی تھی اور یہ بالکل اسی طرح تھا جیسے کہ مشہور فلمی ہیرو کی موت کے موقع پر ٹیلی ویژن پر نہ صرف اس کی فلمیں دکھائی جاتی ہیں بلکہ ان ہیروئنوں کے چہرے بھی دِکھائے جاتے ہیں جن کے ساتھ اس ہیرو نے کام کیا تھا''۔(۱)

بلاشبہ انسان جب حد سے تجاوز کرنے لگتا ہے تو پھر اسے مالک دو جہاں امتحان کے کھنڈر میں دھکیل دیتا ہے، کیوں کہ اس کی پکڑ بہت شدید ہے۔ انسانی دنیا پر نہ جانے اس امت سے قبل بھی ڈھیروں عذاب الٰہی، قہر خداوندی وبا کی شکل میں اتارے گئے۔ انسان کی سرکشی جب گرفت میں آتی ہے تو پھر انسان مجبور محض بن کر رہ جاتا ہے پھر اس کا اختیار سلب کر لیا جاتا ہے۔ نتیجتاً ہر طرف موت ننگا ناچ ناچتی ہے۔ وہ رحمٰن اور رحیم ضرور ہے مگر یاد رہے کہ قہار و جبار بھی ہے۔ ناول میں اس حقیقت کی تصویر کشی یوں کی گئی ہے:

''کیا خدا انسانوں کو ان کے گناہ اور برے اعمال کے لیے ہمیشہ معاف ہی کرتا رہے گا۔ انسان جو گناہ کرنے سے کبھی دائمی توبہ تک نہیں کرتے تھے۔ خدا کا کام معاف کرنا اور رحم کھانا ہی نہیں، سزا دینا اور عذاب نازل کرنا بھی ہے اور اس بات سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ صرف معاف کر دینے والے خدا کو کوئی نہیں مانتا۔ مان ہی نہیں سکتا۔(۲)

ناول نے سماج کے اس دوغلے پن کو بھی اجاگر کیا ہے جو عورتوں کو شادی کے بعد اکثر اس کے خدوخال کو امید کے برخلاف پانے کی وجہ سے کوستے ہیں؛ لیکن کئی بار یہ باتیں صحیح بھی ہوتی ہیں۔ دنیا شہوانیت سے خالی کر دی جائے تو یہ دنیا بالکل بدصورت اور اس کا نظام سکون غارت ہو کر رہ جائے گی۔ شہوانیت ہی تو ہے جو ایک دوسرے کے جسم کی اہمیت اور قدر و قیمت کو ظاہر کرتا ہے۔ شہوت اس دنیا کی سب سے انمول شے ہے۔ یہ محفل جس قدر بھی سجادی جائے مگر 'تو' جو نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے'' کا مصداق ہے۔ جسم کی خوشبو دنیا کی تمام لذتوں سے سوا ہے۔ ایک روز وہ شدید گرمی کی وجہ سے اپنا بریسیئر اتار کر پھینک دیتی ہے۔ اس کے لٹکے لٹکے اور ڈھیلی ڈھیلی پستان کو دیکھ کر مرد بول پڑتا ہے:

''تمھاری چھاتیاں کتنی لٹکی ہوئی اور ڈھیلی ڈھالی ہیں۔ تم نے اپنی عمر غلط لکھوائی ہے۔ تم مجھ سے عمر میں بڑی ہو۔ شوہر نے مرد میں تبدیل ہوتے ہوئے غصے کے ساتھ کہا۔ وہ رونے لگی۔ تمھیں رونے کے علاوہ کچھ اور بھی آتا ہے۔ وہ اور زور سے رونے لگی۔ یا پھر اگر تمھاری عمر وہی ہے جو تمھاری ماں نے بتائی تھی تو تم شادی سے پہلے کی کھائی کھیلی ہوئی ہو۔ مرد کے لہجے کا زہر آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا، جس طرح جسم میں کوئی خطرناک بخار آہستہ آہستہ بڑھتا ہے۔ وہ بھونچکی ہو کر اسے دیکھنے لگی ہے۔ دیکھ کیا رہی ہو؟ مجھے تو شادی کی پہلی رات میں ہی شک ہو گیا تھا''۔(۳)

نہ جانے کیوں سماج میں ہمیشہ عورت کو ہی مجرم ٹھہرا جاتا ہے۔ جب کہ اس بدفعل سے مرد بھی پیچھے نہیں رہتے ہیں۔ آج بھی گاؤں میں دیکھا جاتا ہے کہ اگر چہ ایک مرد ہزاروں عورتوں کے ساتھ بستر گرم کرتا ہو، اس کی شادی بآسانی ہو جاتی ہے مگر اسی جرم میں اگر کوئی لڑکی ملوث پائی جائے تو پھر ہر طرف تھڑی تھڑی ہونے لگتی ہے۔ اس لیے کئی بار اس سماج کی دورخا پن کی وجہ سے بعض لڑکیاں کئی بار جسمانی ہراسمنٹ کے باوجود وہ اس بات کو معاشرہ میں ظاہر نہیں کرتی ہیں جس کی وجہ سے اور بھی وحشی مردوں کا وحشیانہ پن سر چڑھ کر بولتا ہے۔ ایسے میں عصمت دری کا خاتمہ کیونکر ممکن ہے؟ جب تک لڑکیوں کو بھی مردوں کی طرح معاشرہ میں اس کی غلطی کے بعد بھی ویسا ہی برتاؤ نہ کیا جائے تب تک اس کے ساتھ غیر مرد اسی طرح زیادتی کرتا رہے گا۔

پانی کی پیدائش میں رب نے اپنے دست قدرت سے وہ کمال دکھایا ہے کہ دنیا اس کے بغیر بالکل انجان بستی ہے۔ ایسی انجان بستی جہاں نہ انسان بس سکتا ہے اور نہ ہی جانور۔ قدرت کی یہ مشیت ہے یا شیطان کی بے ہودہ سازش کہ ابن آدم کہیں پانی سے مرتا ہے تو کہیں پانی کے لیے مرتا ہے۔ پھر ایسے وقت میں تشنگی کا مارا شاعر نکل جائے تو پھر اس کے تخیل سے کیا نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ کریں:

یہ خدا کی بنائی ہوئی اصل دنیا نہیں معلوم ہوتی ہے۔ یہ اصل دنیا کی پیروڈی ہے۔ شیطان کی لکھی ہوئی پیروڈی۔ مجھے خدا کے پاس جانا ہے۔ خدا کی اصل دنیا میں ہی مجھے پانی ملے گا۔ ہلکورے مارتا ہوا پانی۔ آبِ حیات بھی وہیں۔ یہاں تو آبِ مرگ یا آبِ فناتک کا ایک قطرہ نہیں بچا ہے۔ مجھے احساس ہو چلا ہے کہ میرا یہ

کہنا یا ارادہ کرنا اب ایک خنجر کو پانی کے اندر چلانے جیسا ہے۔(۴)

بعض جگہوں پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم نے ناول کے اوراق نگل لیے ہیں۔ جیسے ذیل میں اس جگہ قاری کو احساس ہونے لگتا ہے کہ وہ ناول کی سرحد سے نکل کر تاریخ کے کھنڈرات میں تاریخی آہنگ کے ساتھ بھٹک رہا ہے:

''.....چار سو سال قبل مسیح یونان کے مشہور فلسفی تھیلس نے تو پانی کو ہی حقیقت مطلق قرار دے دیا تھا۔ مگر زندگی کے ساتھ ساتھ پانی موت اور فنا کی بھی علامت ہے۔ زمین پر پانی کے مقابلے خشکی کا حصہ صرف ایک تہائی ہی ہے۔ انسانی جسم کا ستر فیصد حصہ پانی ہی ہے۔ قدیم یونان میں پانی کو ایک عظیم دیوتا کا درجہ دیا گیا تھا اور بعد میں جل پری، بنت البحر، آبی حسینہ اور شریر آبی بونے کی ایجاد بھی کر لی گئی تھی۔ وہ مقدس مقامات جہاں دیوتا پیشین گوئیاں کرتے تھے۔ دریاؤں کے کنارے ہی واقع تھے۔ ان کی قدیم عبادت گاہیں اور پرانے بڑے گرجا گھر بھی پانی کے ہی قریب تعمیر کیے گئے تھے اور آج بھی بپتسمہ کی رسم پاک وصاف پانی کے ذریعے ہی ادا کی جاتی ہے۔ پانی اگر چہ رقیق مادہ ہے مگر درجۂ حرارت کی مناسبت سے ٹھوس مادے میں بھی بدل سکتا ہے اور گیس یا ہوا بن کر اڑ بھی سکتا ہے۔ پانی کی مبادیات اتنی آسان نہیں۔ مگر دورِ حاضر میں (1988) فرانس کے ایک سائنس دان ژاک بین وِن نے ہومیوپیتھی کے علاج کے تعلق سے پانی کے بارے میں ایک عجیب وغریب نظریہ پیش کیا۔ ژاک بین وِن کا کہنا تھا کہ پانی کی اپنی ایک باقاعدہ یادداشت بھی ہوتی ہے۔''(۵)

جس سچائی کے ساتھ مصنف نے اس ناول میں حالات کی منظر کشی کی ہے اس کے لیے وہ قابل تحسین اور مبارک باد کے مستحق ہیں۔ وبا کے موضوع پر لکھے گئے اس ناول کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ پانی کا ختم ہونا ایک بڑا المیہ ہے۔ پانی پر قبضے اور اس پر حق جتانے کے لیے بڑی بڑی جنگیں ہوئیں اور ہوسکتی ہیں۔ آج بھی پوری دنیا میں پانی کو لے کر ایک ملک دوسرے ملک کے ساتھ اور ایک صوبہ دوسرے صوبے کے ساتھ لڑتا جھگڑتا ہے۔

مصنف نے نیکی اور بداعمالی سے وقوع پذیر ہونے والے حالات کے نتیجے کو یکجا ہی نہیں کیا ہے بلکہ اس ناول سے پانی کی اہمیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ گویا پانی ہے تو جگ جیون ہے، پانی ہے تو زندگی ہے، پانی ہے تو کائنات ہے۔ وبا پر اس سے پہلے بھی کئی ناول اور افسانے لکھے جا چکے ہیں۔ جیسے: ۱۸۲۷ء۔ اطالوی ناول نگار ایلیسانڈرو میزونی (Alessandro Manzoni) کا ناول ''منکوحہ'' (Betrothed) گیبرئیل گارسیا مارکیز کا 'وبا کے دنوں میں محبت' (Love in the Time of cholera. 1985) میں ہسپانوی اور 1967 میں انگریزی زبان میں شائع ہوا)۔ ڈینیئل ڈیفو کی تحریر کردہ ''تذکرہ وبا کے سال کا (اے جنرل آف دی پلیگ ایئر 1722)''۔ کیتھرین این پورٹر کا 'پیلے ہورس رائڈرز' (1939)۔ فیوڈور ڈوسٹویوسکی کے ناول ''جرم و سزا'' (Crimeand Punishment)۔ البرٹ کامو کے 'پلیگ'۔ مارگریٹ ایڈون کا 'دی ایئر آف دی فلڈ' (2009)۔ ایملی سینٹ منڈیل کا 'سٹیشن الیون' (2014) اردو ادب میں بیدی کا 'کوارنٹین' اس حوالے سے انور سدید نے بھی خامہ فرسائی کی ہے۔ اس کورونا وبا کے دوران ہی پاکستان سے دووبا نمبر ''ذوق: 8 وبا نمبر'' ''دنیا زاد'' اور حال ہی میں عالمی اردو ٹرسٹ کی طرف 'عالمی جائزہ ،کاوبا نمبر (اگست 2021- مدیر اے رحمان) ایک اور ناول ڈاکٹر مہیشور پرساد چورسیا کا Just Switch Off Corona بھی منظر عام پر آیا ہے۔ اسی طرح نذیر فتح پوری کا ''کورونا وائرس: بائیس کہانیاں، ایم زیڈ کنول کا ''درد کی دہلیز پر'' (شعری مجموعہ) طٰہٰ نسیم کا ''کورنا وبا یا عالمی سازش'' مناظر عاشو ہرگانوی کا مرتب کردہ ''کرونا وائرس: افسانچے''، کرونا وائرس: منظوم اور کورونا وائرس: لطیفے۔ محمد اعظم ندوی کا ''کورونائی ادب'' اور عبدالصمد کا ناول ''کشکول'' وغیرہ بھی قابل ذکر ہیں۔

☆☆☆

حوالے:

(۱) ایک خنجر پانی میں، مصنف، خالد جاوید، ص:94 ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی۔
(۲) ایک خنجر پانی میں، مصنف، خالد جاوید، ص:125 ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی۔
(۳) ایک خنجر پانی میں، مصنف، خالد جاوید، ص:135 ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی
(۴) ایک خنجر پانی میں، مصنف، خالد جاوید، ص:146 ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی
(۵) ایک خنجر پانی میں، مصنف، خالد جاوید، ص:88 ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

''غزل ساز'' شاعر: حافظ کرناٹکی

ڈاکٹر ریشما قمر

(شعبۂ اردو و فارسی، گلبرگہ یونیورسٹی، کلبرگہ، کرناٹک Mob 7259673569)

اشعار کے گلشن کو یوں تم نے نکھارا ہے ہر شعر سلیقے سے سانچے میں اتارا ہے
سنگلاخ زمینوں میں کب شاعری آساں تھی دے دے کہ لہو اپنا اس فن کو نکھارا ہے

حافظ کرناٹکی کا شمار کرناٹک کی ممتاز اور مشہور شخصیتوں میں ہوتا ہے جن کے عمدہ کاموں سے وہ عوام و خواص دونوں میں معروف ہیں انتظامی صلاحیت، جدت طرازی، تعمیر و تشکیل کا فطری ذوق، باکمال شاعر کے علاوہ صحافت میں بھی بے باک صحافت کے علمبردار رہے ہیں۔ ہمدردی، اخوت، بھائی چارگی اور دینی و ملی مسائل پر فکرمندی کا احساس و اظہار ایک آفاقی جذبہ ہے جو ہر کسی کو متاثر کرتا ہے یہ ایسا وصف ہے جو انسان کو ذاتی مفاد سے بالاتر ہو کر بے غرض اور بے لوث زندگی جینے کا حوصلہ عطا کرتا ہے۔

ریاست کرناٹک کے ضلع شیموگہ کے تعلقہ شکاری پور میں ایک ایسی شخصیت ابھری جو وہاں کی تاریخ کا حصہ بن گئی ہے جن کا اصل نام امجد حسین ہے جو حافظ کرناٹکی کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کے سماجی و قومی اور ملی کارناموں نے انھیں شہرت و عزت عطا کی۔ عزم و استقلال کا پہاڑ ہیں حالات کے تھپیڑے آپکے عزم و استقلال اور پایہ استقامت کو متزلزل نہیں کر سکے ان کی شخصیت یقین محکم، عمل پیہم، حق گوئی و بے باکی، جذبہ ایثار و قربانی اور بلند حوصلگی جیسے مضبوط ستون پر قائم ہے۔ اپنی زندگی کے تقریباً سال افکار ملی و سماجی اور ادب اطفال کے مسائل کے گیسوئے برہم کو سنوارنے میں گزر تیجار ہے ہیں وہ اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں۔ ذات ایک ہے لیکن روپ انیک ہیں حافظ قرآن، شعلہ بیان مقرر شاعر اطفال، قلم کا شہسوار، قوم کا نغمگسار، قناعت شعار، عزم کا پہاڑ، عاشق رسول، پاسبان اردو ہر نام کے مستحق ہیں۔

ندیمؔ الفاظ و معنی کا خزانہ اسکے اندر ہے کہ بند جیسے کوزے میں کوئی گہرا سمندر ہے

حافظ کرناٹکی ایک باکمال شاعر ہیں ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی نعت گوئی، نظم نگاری، غزل گوئی، مثنوی، رباعی اور قطعہ ہر صنف میں خوبصورت اشعار کہے ہیں شمس فریدی آپ کی شاعری کے متعلق رقمطراز ہیں۔

''آپ ایک قادرالکلام شاعر ہیں اور شاعر اطفال کی حیثیت سے آپکا مرتبہ کافی بلند ہے۔''

(۱)

ان کی نعت گوئی کے کئی مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ نعت گوئی بڑا مشکل فن ہے اس کے لیے صرف زبان و بیان پر قدرت ہی کافی نہیں شاعرانہ صلاحیت اور فنی محاسن کے ساتھ فکر ونظر کی پاکیزگی، عشق رسول میں سرشار دل اور سوز و گداز سے پر جذبات چاہئے اللہ تعالیٰ نے آپکو نعت گوئی کے تمام لوازمات سے نوازا ہے آپکی نعت گوئی سے متعلق عالم خورشید رقمطراز ہیں۔

''نعتیہ کلام کا مجموعہ (شمع ہدی) پڑھ کر تو آپ کے لئے دل میں احترام وعزت کا جذبہ شدت اختیار کر گیا کیونکہ اس کتاب سے نہ صرف اردو زبان وادب کی آبیاری بھی ہوگی جو قصہ پارینہ میں تبدیل ہوی جارہی ہے۔''

(۲)

حافظ کرناٹکی کو نعت گوئی میں کمال حاصل ہے ان کی شاعری مختلف موضوعات اور مختلف اصناف شاعری کا مرقع ہے اب تک موصوف کی درجنوں کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔زیر نظر تصنیف ''غزل ساز'' حال ہی میں دیدہ زیب سرورق کے ساتھ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع ہوئی۔غزل ساز کی طباعت اول ۲۰۱۷ میں ہوچکی تھی اور یہ طبع دوم ہے جس میں حافظ کرناٹکی نے اپنی غزل گوئی کے متعلق اپنے خیالات پیش کئے ہیں اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

''آپ جانتے ہیں اردو میں شاعری کرنا غزل کے بغیر ممکن نہیں ہے کیونکہ ع

چھٹتی نہیں ہے کافر منہ سے لگی ہوئی

سو میں نے غزلوں کا انداز تھوڑا سا بدل دیا اور غزلوں کے کئی مجموعے شائع کروائے مثلاً ننھی منی غزلیں، معصوم غزلیں اور بچوں کی غزلیں وغیرہ۔آپ جانتے ہیں کہ مشاعرہ غزل کے بغیر اپنے رنگ میں نظر نہیں آتا ہے اس لیے میں نے بھی بسا اوقات غزلیں کہنے کو روا رکھا۔اور کبھی کبھی مشاعرے کے حسب حال بھی غزلیں کہیں اس کے باوجود حتی المقدور احتیاط سے کام لیا یعنی اپنے آپ کو تخیل کی رنگین دنیا میں بہت دور تک جانے کی اجازت نہیں دی کہ مبادا واپسی مشکل ہوجائے۔''

(۳)

زیر نظر تصنیف کا دیباچہ ڈاکٹر رونق شہری نے بہت عمدہ انداز میں تحریر کیا ہے۔''حافظ کرناٹکی کی غزلوں میں ارضیت پسندی'' کے زیر عنوان حافظ کرناٹکی کی غزل گوئی کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔مقدمہ دلچسپ اور غزل ساز کا آئینہ معلوم ہوتا ہے۔ڈاکٹر رونق شہری رقمطراز ہیں۔

''حافظ کرناٹکی ایک جامع کمالات شاعر ہیں انکا اشہب قلم مختلف شعری اصناف میں تیزی سے دوڑتا ہے انکی ذہانت خداداد ہے ۔۔۔انکی شاعری میں زندگی سے براہ راست مکالمہ قائم کرنے کا ہنر انھیں حقیقت پسند شاعر ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔''

(۴)

''غزل ساز'' ۸۱ غزلوں سے مزین گلدستہ ہے جس میں ہر رنگ وبو کی غزلیں ہیں غزل اردو ادب کی معرکتہ الآرا صنف رہی ہے یہ شاعری کا معیار سخن ہے۔

غزل میں ذات بھی ہے اور کائنات بھی
ہماری بات بھی ہے اور تمہاری بات بھی

(۵)

میرؔ ہو کہ غالبؔ، حالیؔ ہو کہ انشاءؔ، حسرتؔ ہو کہ فانیؔ، اصغرؔ ہو کہ جگرؔ سب غزل کی زلفوں کے اسیر نظر آتے ہیں۔صرف برصغیر ہی کیا ساری دنیا میں مقبول خاص وعام صنف سخن ہے۔جو صرف دو ہی مصرعوں میں کم سے کم الفاظ میں بڑی سے بڑی بات کو بیان کر دیتی ہے اور اسکا انداز دلوں کو چھو لینے والا ہوتا ہے ۔حافظ کرناٹکی نے اپنے درد وغم کو سمیٹ کر اپنے ٹوٹے دل کو بھٹکنے سے بچانے کے لئے شاعری میں خون کے آنسو بہانے کا سامان کرلیا۔تاہم حافظ کرناٹکی نے اپنے تمام درد ہائے زندگی، زندگی کے نشیب وفراز کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ اشعار کے قالب میں ڈھال کر اپنے لئے تسکین کا سامان بنالیا ہے یقیناً یہ درد اور فریب خوردہ زندگی کی کسک پڑھنے والوں کو بھی جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے حزن و ملال اور حسرت ویاس پر انکا یہ کلام دیکھئے۔

جب بھی کاغذ پہ چلتا ہے میرا قلم
خون دل کا اگلتا ہے میرا قلم
جو بھی لکھنا ہے لکھ کر ہی پاتا ہے چین
کب رویہ بدلتا ہے میرا قلم
سچے الفاظ شعلوں سے کچھ کم نہیں
جنکو لکھ لکھ کے جلتا ہے میرا قلم

اسی طرح یہ اشعار بھی خود کی بے کسی اور اوروں سے گلہ شکوہ کا مظہر ہے۔

میں نے غم تیرا زمانہ سے چھپا رکھا ہے
اپنی پلکوں میں سمندر کو دبا رکھا ہے

اے نئے دور کے فرعون ذرا ہوش میں آ
میرے ہر ایک سپاہی نے عصا اٹھا رکھا ہے

آئینہ کتنا ہے عیار نہ پوچھو حافظؔ
اپنا ہر عیب یہ ظالم نے چھپا رکھا ہے

ان کی شاعری میں خاص طور پر غزلوں میں عشق کی کیفیت ، زور بیان اور انسانی جذبات کی ترجمانی ملتی ہے آپکی غزل گوئی کے متعلق سید شکیل دسنوی رقمطراز ہیں۔

''انھوں نے غزل جیسی بت ہزار شیوہ صنف سخن کو Bonsai (خورد قامت) کر کے بچوں کے احساسات ،خیالات ، موضوعات اور جبلت کی آمیزش سے غزلیہ اشعار میں انکا موثر اظہار بڑی چابکدستی کے ساتھ کیا ہے۔''

(۶)

انھوں نے اپنی غزلوں کو پاکیزگی اور اصلاح کا ذریعہ بنایا ہے ۔حسن وعشق کی پاکیزگی اور عقیدت وتڑپ کو بہترین پیرایئے کے اشعار میں ڈھال دیا ہے۔

وہ میری ماں کا تصور ہے جو شب بھر اکثر
تھپکیاں دے کر سلاتا ہے اندھیرے میں مجھے

گھولتا ہے کوئی کانوں میں اجالے میرے
نغمہ نور سناتا ہے اندھیرے میں مجھے

میرے بچپن کی طرح آج تلک اے حافظ
شور اذانوں کا جگاتا ہے اندھیرے میں مجھے

حافظ کرناٹکی کو بچوں سے خصوصی لگاؤ ہے بچے ہمارے قوم کا مستقبل ہے ۔اور ہمارے شعراء وادباء نے زمانہ قدیم سے ہی ادب اطفال کے نمونے اپنی تخلیقات میں پیش کئے ہیں نظیر اکبر آبادی ، اقبال ، چکبست اور حالی جیسے شاعروں نے بچوں کے لئے اصلاحی اور اخلاقی اقدار کو شعری پیکر عطا کئے ہیں دور حاضر میں حافظ کرناٹکی اپنی شاعری کو نونہالان قوم کی اصلاح کا وسیلہ بنا رہے ہیں ادب اطفال کے متعلق آپ کی کئی تصنیفات منظر عام پر آچکی ہیں بچوں کے ادب سے دلچسپی کا اندازہ ان اشعار سے لگایا جاسکتا ہے۔

باغ اطفال کی بہاروں میں
لمحہ لمحہ اسیر ہونا ہے
بچوں کے واسطے ہے فن میرا
مجھ کو غالبؔ نہ میرؔ ہونا ہے

زیر نظر تصنیف میں بچوں کے لئے بھی اشعار مل جاتے ہیں بچوں کا ادب عمومی طور پر نظم اور نثر دونوں میں پیش کیا جاتا ہے لیکن غزل کی سنگلاخ زمینوں میں حافظ کرناٹکی نے ادب اطفال کے گل بوٹے کھلا کر اپنی انفرادیت کا لوہا منوالیا ہے۔

ترک کردو، رنگ برنگی عادتیں
لازمی ہیں سیدھی سادھی عادتیں

کیوں نہ دیکھے گا وہ اچھائی کے دن
جس نے اپنا لی ہیں اچھی عادتیں

کس طرح مثبت نتیجہ لائیں گی
بے طرح، بت کار ، منفی عادتیں

جس قدر ہو پائے جلدی چھوڑ دو
زندگی برباد کردیتی ہیں عادتیں

حافظ کرناٹکی کی غزلیں اصلاحی مقاصد کی حامل ہیں اور اسلوب نہایت ہی شگفتہ اور رواں دواں ہے۔آپ جہاں ایک کامیاب نظم نگار ہیں وہیں ان کی غزل کی ست رنگی سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا ان کی غزلوں میں ماحول، تہذیب اور سماج کی عکاسی کے علاوہ انکے ذاتی تجربات ،احساسات اور مشاہدات کا بھر پور احساس ملتا ہے۔

جیتنا ہو تو ہارنا سیکھو
نفس کو اپنے مارنا سیکھو

گھر کے طوفان میں مسائل کے
حوصلوں کو ابھارنا سیکھو

عصری حسیت یا عصری آگہی میں بڑی وسعت ہے شاعر کو سماج کا نباض کہا جاتا ہے اس لیے ان کے کلام میں عصری عناصر دوسرے فنکاروں کی بہ نسبت زیادہ پائے جاتے ہیں اور عصری آگہی بھی، تمام تر شعبہ ہائے زندگی کے ساتھ جلوہ گر ہے۔

اب عدالت میں بھی انصاف کہاں ہے ممکن
رشوتیں گرمی دکھائیں تو دلیلیں جھلسیں

ہمارے ملک میں ہے حکمرانی جھوٹوں کی
یہاں جو سچ کہے سنگسار ہونے والا ہے

یہ شہر ہے یا کوئی سانپوں کا جزیرا ہے
ہر کوئی گلے مل کے جذبات کو ڈستا ہے

آج مادیت پرستی کو عروج حاصل ہے۔ مادیت پرستی اور مغربی اقدار کی اندھا دھند تقلید نے انسانیت کا خاتمہ کر دیا ہے ایسے تشویشناک ماحول میں حساس شاعر جس کرب سے گزرتا ہے اس کا اظہار حافظ کرناٹکی نے بہت ہی خوبصورت انداز میں کیا ہے۔

جو شخص سچ کے سوا بولتا نہیں کچھ بھی
وہ جلد موت کا حقدار ہونے والا ہے

تخت و تاج بکتے ہیں اقتدار بکتا ہے
مال ہے یہ بکنے کا بار بار بکتا ہے

آج کل بھروسے کا مول ہی نہیں کوئی
وعدے توڑے جاتے ہیں اعتبار بکتا ہے

مذہب سے بے زاری، اخلاقی اقدار کا فقدان کی وجہ سے دور حاضر میں رشتوں سے دوری، وفاداری، محبت، صلہ رحمی اور عجز وانکساری دم توڑتی جارہی ہے حافظ کرناٹکی نے اس ماحول کی عکاسی بھی اپنی غزلوں میں کی ہے۔

آج میں کچھ ایسے زندہ ہوں
اک اک سانس سے شرمندہ ہوں
آنکھ روتی ہے دل سسکتا ہے
جل رہے ہیں چمن بہاروں میں

ان کی غزلوں میں نشتریت ہے ایسا لگتا ہے کہ اطراف واکناف کے ماحول سے بر گشتہ ہیں اور اپنے ماحول کو بدلنے کی بھر پور خواہش رکھتے ہیں حالات کو یکا یک نہیں بدل سکتے لیکن ان پر سخت چوٹ کرا اپنا جی ہلکا کر لیتے ہیں۔

ظرف جیسا تھا ویسے دکھائی دیا
مجھ کو قطرے میں دریا دکھائی دیا

جب بصیرت کی رکھی گئی شرط تب
آنکھ والا بھی اندھا دکھائی دیا

کھا گئی دھوکا چشم عقیدت مری
اور شیطاں فرشتہ دکھائی دیا

بچہ بچہ عداوت بھرے عہد کا
باپ کے خون کا پیاسا دکھائی دیا

مجموعی طور پر زیر نظر تصنیف کی غزلوں میں جذبوں کی روانی کے ساتھ تفکر کی صلابت بھی ہے ''غزل ساز'' اسلوب وفکر کا ایک دل پذیر مجموعہ ہے قارئین کو غور کرنے کی دعوت دیتا ہے مجھے توقع ہے کہ حافظ کرناٹکی کی فکر و نظر کے اور بھی بہت سے نمونے ہمارے ادبی سرمایے میں اضافے کا باعث بنیں گے۔

وہ تجربے جو حافظؔ حاصل ہوئے دنیا سے
میں نے انہیں چن چن کے شعروں میں پرویا ہے

☆☆☆☆

حوالہ جات:

۱) غزل ساز۔از حافظ کرناٹکی
۲) حافظ کرناٹکی حیات اور خدمات۔ از۔آفاق عالم صدیقی ص ۲۶۸
۳) غزل ساز۔از۔حافظ کرناٹکی ص ۴۔۳
۴) غزل ساز۔از۔حافظ کرناٹکی ص ۱۰
۵) غزل کا فن۔از۔کامل قریشی
۶) رسالہ شاعر جون ۲۰۱۳ ص ۲۵

ولی کی غزلیات میں محبوب کا تصور

وقار توحید

(ڈپارٹمنٹ آف ایجوکیشن (ایم ایڈ)، ناگارجن یونیورسٹی، گنٹور، آندھراپردیش، Mob: 9334540656)

اردو شاعری میں اولیت کا تاج تو امیر خسرو (1253-1325) کے سر ہے لیکن اردو شاعری کا باوا آدم ولی (1668-1725) کو کہا گیا ہے اور ان کی شاعری کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ان کو یہ خطاب بجا طور پر دیا گیا ہے۔ کیونکہ ولی سے پہلے اردو شاعری تقریباً تین سو سال کا سفر طے کر چکی تھی لیکن اسے وہ عروج میسر نہ آسکا تھا جو ولی کے بعد ملا۔ ولی کی شاعری کا امتیازِ خاص یہ ہے کہ وہ اردو کے ان معدودے چند شعراء میں سے ہیں جن کی غزل پڑھ کر غم کی کیفیت کے بجائے طبیعت پر شگفتگی طاری ہوجاتی ہے۔ انھوں نے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن غزل نے انھیں بقائے دوام عطا کیا ہے۔ ان کے کلام میں ایک خاص طرح کی رنگینی اور دلکشی پائی جاتی ہے۔ ان کی شاعری کا تعلق براہ راست ان کے جذبات و احساسات اور تجربات سے ہے۔ ان کی غزل میں کوئی تکلف و بناوٹ نہیں اور نہ ہی حسن و عشق کے بیان میں وہ مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہیں۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں عشق کی واردات و کیفیات کی ترجمانی بڑے والہانہ انداز میں کی ہے۔ ان ہی کی اردو غزل سے متاثر ہوکر شمالی ہند کے فارسی گو شعراء نے اردو غزل گوئی کی طرف توجہ کی، اسی بناء پر انھیں اردو کا امام المتغزلین کہا گیا ہے۔

ولی نے اپنی غزلوں میں نئی تشبیہوں اور استعاروں کا خوب استعمال کیا ہے اور ان میں پاکیزگی اور شائستگی کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔ چونکہ انھوں نے فارسی شعر و ادب کی بھی خوشہ چینی کی ہے اور ہندی الفاظ و محاورات کا بھی دلکش انداز میں استعمال کیا ہے۔ اس لیے ان کی غزل گوئی میں بانکپنے کا ایک مخصوص رنگ پایا جاتا ہے۔ اس کے باوجود یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کی شاعری میں فلسفیانہ فکر و نظر کی رفتار کمزور ہے۔ کائنات کے اسرار و رموز سے متعلق مواد ان کی شاعری میں کم ملتے ہیں اور دنیا کی بے ثباتی کے مضامین کی تکرار پائی جاتی ہے۔ بنیادی طور پر ان کی شاعری میں مضمون آفرینی محبوب کے جسمانی حسن کے بیان تک محدود ہے۔ اس میں تخیل کی کارفرمائی میں تنوع کا رنگ ناپید ہے جو غزل کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ان کے اس کارنامے سے کس کو انکار ہوسکتا ہے کہ انھوں نے اردو شاعری کو گیت کی فضا سے نکال کر غزل کے مزاج سے قریب تر کرنے کی کوشش کی ہے۔ تشبیہ و استعارے کے رنگ کو ملاحظہ کیجئے:

اے کعبہ رو کھڑا تو ہوا جوں ادا کے ساتھ　　بولے مکبر ان کہ قد قامت الصلوٰۃ

یو تل تجھ مکھ کے کعبہ میں مجھے اسود حجر دستا　　زنخداں میں ترے مجھ چاہ زمزم کا اثر دستا

ولی کی غزل گوئی میں فکر کے عناصر کا فقدان تو ضرور پایا جاتا ہے تاہم ان کے یہاں نظامیاتی اسالیب کے وسیع استعمال میں غزل کی حرکیت میں بصارت کے عمل دخل کو صاف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یہی وہ رجحان ہے جو تشبیہات و استعارات کے استعمال اور قوت باصرہ کی محرکات پر مبنی ہے۔ کیونکہ اس اسلوب کو برتنے میں لامسہ، سامعہ اور شامہ سے زیادہ باصرہ کی کارفرمائی زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ چنانچہ ولی کا محبوب ایک نور کا پیکر ہے جس کو وہ سورج، شعلہ، آئینہ، روشنی و رنگ سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کے یہاں ساری مسرتوں کا راز تاریکی کے چھٹنے اور روشنی کے پھیل جانے میں مضمر ہے۔ ولی کی حسِ کی تیزی کا اندازہ ان کے اس شعر سے لگایا جاسکتا ہے:

مکھ تیرا آفتابِ محشر ہے
نور اس کا جہاں میں گھر گھر ہے

صنم مجھ دیدہ و دل میں گزر کر
ہوا ہے باغ ہے آب رواں ہے

ولی کی کائنات میں روشنی و رنگ کے عکس کے مظاہر تاباں ہیں۔ انھوں نے ان میں اشیاء کی تشریح و تفہیم روشنی کی زبان میں کی ہے۔ انھوں نے محبوب کی پرستش کے جذبے کو ترک نہیں کیا بلکہ ایک آتش پرست کی صورت میں ظہور کی سعی کی ہے، اسی لیے ولی کا محبوب سورج کی مانند کشش ثقل کا حامل سیارہ صورت ہے اور شاعر ہر صبح بیدار ہوتے ہی اس کی پرستش کو ایک فریضے طور پر انجام دیتا ہے۔ شاعر کی اس روش کی توضیح ان اشعار سے ہوتی ہے:

دیکھنا ہر صبح تجھ رخسار کا
ہے مطالعہ مطلع انوار کا

ٹک ولی کی طرف نگاہ کرو
صبح سوں منتظر ہے درشن کا

عجب کچھ لطف رکھتا ہے، شبِ خلوت میں گل روسوں
خطاب آہستہ آہستہ، جواب آہستہ آہستہ

مذکورہ اشعار میں شاعر نے حسن و عشق کی خاص کیفیتوں کو جس سادگی کے ساتھ پیش کر دیا ہے، وہ قابل داد ہے۔ کہتے ہیں کہ محبوب سے تنہائی میں بات کرنے میں جو لطف ملتا ہے، وہ کچھ الگ ہی نوعیت کا ہوتا ہے۔ محبوب جب بہت بے تکلف نہیں ہوتو وہ دھیمے دھیمے لہجے میں مختصر سوال و جواب والی گفتگو سے عاشق کے آتشِ شوق کو مہمیزیت سے دوچار کرتا ہے اور خود بھی سرشاری کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ولی نے بھی اپنے محبوب سے کچھ اسی نوعیت کا تعلق روا رکھا ہے۔ دراصل حسن و جمال کو انھوں نے اپنے محبوب کی اداؤں میں دیکھا اور وصل کی لذتوں کے خیالات کو شعری پیرہن عطا کیا۔ اسی لیے محسوس ہوتا ہے کہ ولی کا محبوب محض خیالی پیکر نہ ہو کر ایک مکمل اور زندہ دلی کی حامل ہستی ہے اور وہ دکنی یا گجراتی حسن کا مجسمہ ہے۔ ولی کا محبوب مہرباں، محبت آشنا اور وفا پرست ہے، نہ کہ سفاک، ظالم اور جفا و جور کا مترادف۔ شعر ملاحظہ کریں:

عیاں ہے ہر طرف عالم میں حسن بے حجاب اس کا
بغیر از دیدۂ حیراں نہیں جگ میں نقاب اس کا

ہوتا ہے جیوں مرا شاد اس کی ہنسی سوں
اگر جو ہنس کے نہ کہے بات گلِ عذار چہ خط

تجھ گھر کی طرف سمندر آتا ہے ولی دائم
مشتاق درس کا ہے ٹک درس دکھاتی جا

ولی کی غزلوں میں عشق کے نشاطیہ پہلو کی ترجمانی اتنی شدید نظر آتی ہے کہ اس کے درد و غم کا پہلو بڑی حد تک پس پشت چلا جاتا ہے۔ مگر یہ ترجمانی کبھی تعیش پسندی یا لذت پسندی کی سرحدوں میں داخل نہیں ہوتی:

رات دن تجھ جمال روشن سوں
فضلِ پروردگار شامل ہے

رشک سوں تجھ لباں کی سرخی پر
جگر لالہ داغ داغ ہوا

نہ جاؤں صحنِ گلشن میں کہ خوش آتا نہیں مج کوں
بغیر از ماہ رو ہرگز تماشا ماہتابی کا

ولی کے یہاں محبوب کے حسن کی جو تصویر ملتی ہے، وہ یقیناً ان کی تخیل طرازی کا نمونہ نہ ہو کر ان کے اپنے مشاہدات کے بیانیہ عنصر کی مثال ہے۔ محبوب کے جسم کو یوں لفظوں کے لبادے سے تراشتے ہیں کہ ان کا پیکر قاری کی آنکھوں میں اس طرح رچ بس جاتا ہے کہ اس کی ایک خاص شکل نمودار ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ ولی کا محبوب اسی فانی دنیا کی مخلوق ہے جو ان کی آنکھوں میں بسی رہتی ہے۔ وہ جب چاہے اپنے محبوب کے دیدار سے اپنی آنکھوں کو روشن کر لیتا ہے:

ترے دو نین دیکھوں جب نظر بھی
مجھے تب نرگستاں یاد آوے

تجھ چشم سیاہ مست کے دیکھے ستی، زاہد
تجھ زلف کے کوچے منیں ایماں بسر آوے

ولی کے یہاں سراپا نگاری بدرجۂ اتم موجود ہے۔ انھوں نے اپنی اردو شاعری میں محبوب کا پیکر جس انداز میں تراشا ہے اور اس کا بیان شیریں انداز میں کیا ہے، وہ اردو غزل کی روایت میں ان کی ایک امتیازی وصف ہے۔ اس سے پہلے اور بعد میں اس نوعیت کی پیکر تراشی پھر کسی کے یہاں دیکھنے کو نہیں ملتی۔ انھوں نے واقعیت اور تخیل کے بل بوتے اپنے محبوب کو اس قدر دلکش صورت عطا کیا ہے کہ اس کے سامنے دنیا کا تمام حسن ہیچ نظر آتا ہے۔ وہ اپنے محبوب کی تعریف کرتے

ہوئے نہایت ہی حظ و انبساط کا بھی احساس کرتے ہیں:

ہے حسن ترا ہمیشہ یکساں
جنت سے بہار کیوں کے جاوے

ابروکے نزک یہ خال موزوں
خوش مصرعۂ مستزاد دستا

وہ نازنیں ادا میں اعجاز ہے سراپا
خوبی میں گل رخاں سوں ممتاز ہے سراپا

اے شوخ تجھ نین میں دیکھا نگاہ کر کر
عاشق کے مارنے کا انداز ہے سراپا

ولی کے محبوب کے حوالے سے یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ان کے یہاں ہندی الفاظ سے اپنے محبوب کو پکارا گیا ہے اور خطابیہ میں ایک روح کی کیفیت منتقل کرنے کی راست سعی کی گئی ہے، ان کے اس اندازِ تخاطب کو اس شعر میں ملاحظہ کیجئے:

راست کیشاں سوں، اے کماں ابرو!
کج ادائی نہ کر ! خدا سوں ڈر

نرگس نمن رہی نہیں پل مارنے کی طاقت
آ دیکھ اپس انکھیاں کے بیمار کا تماشا

ولی کی غزلیات کے اس مختصر سے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ ان کے یہاں محبوب کا ایک واضح تصور تھا۔ وہ جہاں محبوب کی پرستش کے قائل تھے، وہیں محبوب سے وفا اور محبوب کی خودسپردگی کے بھی طالب تھے۔ اس کے برخلاف اردو شاعری میں ہجر کی کیفیتوں کے بیان پر مشتمل شاعری کو زیادہ جگہ ملی ہے اور مقبولیت بھی۔ لیکن ولی کے یہاں عشق کا تصور یک طرفہ نہ ہوکر گاڑی کے دو پہیوں کے مانند برابری کے درجے کی مانگ پر اصرار سے عبارت تھا۔ عشق کے اس فطری تقاضے کو جب جب پس پشت ڈالا گیا تو معاشرے میں بے راہ روی کی فضا پائی گئی، اسی لیے ولی نے اسے محسوس کیا اور محبوب سے وصل کے مضامین کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا اور ان کا یہ موضوع اپنی نوعیت کی منفرد کوشش ہے اور قابلِ صد تحسین بھی۔

کتابیات:

1۔ کلیات ولی، مرتب : نورالحسن ہاشمی، قومی اردو کونسل، سن اشاعت: 2008

2۔ اردو غزل ولی تک، مرتبہ: ڈاکٹر سید ظہیر الدین، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ممبئی، سن اشاعت: 1961

3۔ دکن میں اردو : نصیرالدین ہاشمی، ترقی اردو بیورو نئی دہلی، سن اشاعت: 1985

☆☆☆

اردو کی ترقی کے لئے اردو کے رسائل واخبارات کو خرید کر پڑھیں
اور
اپنے بچوں کی اردو تعلیم کا انتظام ضرور کریں۔

مشتاق احمد یوسفی کے اقوال زریں

1. یکطرفہ محبت میں دو بڑے فائدے ہیں: ایک یہ کہ اس میں ناکامی کا اندیشہ نہیں۔ دوسرا یہ کہ اس کا دورانیہ کسی دوسرے کی مرضی پر منحصر نہیں۔ آپ جتنی دیر اس میں مبتلا رہنا چاہیں، بلا کھٹکے رہ سکتے ہیں۔ دوطرفہ محبت میں عاشق مزاج لوگوں کو ایک خدشے بلکہ کھلے خطرے کا سامنا ہوتا ہے کہ ذرا بھی غفلت برتیں تو نکاح کی صورت پیدا ہوجاتی ہے۔
—— شام شعر یاراں از مشتاق احمد یوسفی
2. سارا دن ایک دوسرے سے لڑائی کے بعد رات کو ایک ہی مورچے میں آرام کرنے والے بااصول جنگجوؤں کو اردو میں میاں بیوی کہتے ہیں۔
3. عورتیں پیدائشی محنتی ہوتی ہیں۔ اس بات کا اندازہ آپ اس بات سے لگالیں کی صرف 12 فیصدی خواتین خوبصورت ہوتی ہیں باقی سب اپنی محنت سے۔
4. مجھے اس پر قطعی تعجب نہیں ہوتا کہ ہمارے ملک میں پڑھے لکھے لوگ خونی پیچش کا علاج گنڈے تعویذوں سے کرتے ہیں۔ غصہ اس بات پر آتا ہے کہ وہ واقعی اچھے ہوجاتے ہیں۔

مشتاق احمد یوسفی نے اپنی ایک تحریر میں دو دو شعراء کے کلام کو یکجا کر کے مزاح کا نیا رنگ تخلیق کیا ہے، ملاحظہ فرمائیں:

پانی پانی کرگئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
پھر بنیں گے آشنا کتنی ملاقاتوں کے بعد
(علامہ اقبال+فیض)

وہ کہتی ہے سنو جاناں محبت موم کا گھر ہے
کاش اس زباں دراز کا منہ نوچ لے کوئی
(جون ایلیا+آتش)

جھپٹنا پلٹنا پلٹ کر جھپٹنا
ساری مستی شراب کی سی ہے
(علامہ اقبال+میر)

جان تم پر نثار کرتا ہوں
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
(غالب+مومن)

آحمر لکھنوی: شخصیت اور شاعری

ڈاکٹر صوفیہ محمود

(کولکاتا، مغربی بنگال Mob: 7980398423)

حافظ مولوی قاری انوار الحق المتخلص بہ آحمر لکھنوی اردو کے ایک مشہور شاعر ہیں۔ ان کی ولادت ۶/مارچ ۱۹۳۸ء بمقام نادان محل لکھنؤ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم لکھنؤ سے حاصل کی اس کے بعد وہ کلکتہ تشریف لے آئے۔ انھوں نے اپنی شاعری کا آغاز سولہ برس کی عمر میں کیا یعنی ۱۹۵۴ء سے گیسوئے سخن کے اسیر ہوئے۔ ۸/دسمبر ۱۹۹۵ء میں جب وہ کلکتہ سے لکھنؤ کسی رشتہ دار کی تعزیت میں تشریف لے گئے تھے، وہی ان کا انتقال ہوا۔

آحمر لکھنوی کا سلسلہ نسب ایک علمی گھرانے سے ملتا ہے۔ ان کے گھر کا ماحول ادبی تھا اور یہ حافظ مولوی قاری تھے۔ کم عمری سے ہی آنکھوں سے معذور ہونے کے باجود اپنی باطنی صلاحیت سے دنیاوی کشمکش کو محسوس اور عیاں کرتے رہے، گویا محسوس ہوتا ہے کہ شاعری ان کے خمیر میں رچی بسی تھی۔ آحمر جس عہد میں کلکتہ تشریف لائے اس وقت کلکتہ کی شاعری میں ایک نئی نسل کا آغاز ہو چکا تھا اور اس نئی نسل کی ہمنوائی کا شرف آحمر لکھنوی کو ملا ان کے اساتذہ اور دوست واحباب نے بھی خوب حوصلہ افزائی کی۔ کلکتہ میں مختلف مدارس سے منسلک رہے، جن میں مصباح العلوم، فیض العلوم اور دیگر درس وتدریس میں ذہنی طور پر ذریعہ معاش سے جڑے رہے۔ طبی اور روحانی تعلیم نے انہیں خاص شہرت بخشی اور کلکتہ میں بے حد مقبول ہوئے۔ بقول ان کے: ؎

احمر یہ مشغلہ ہے ہمارا روز قرآں کا سننا سنانا

(دیوان آحمر، ص۔۱۵)

آحمر لکھنوی کی شاعری کا مطالعہ اللہ کی اس ربوبیت اور اس کی رحیمی کا مظہر ہے جس کی مثال بہت مشکل سے اردو شاعری میں ملتی ہے، ظاہری آنکھوں سے دنیا کو دیکھنا اور دیکھنے کے بعد خارجی حالات کو پیش کرنا بہت مشکل کام نہیں لیکن آنکھوں کی بینائی کے بغیر دنیا کے حرکات وسکنات کو محسوس کرنا اور محسوس کر کے بہت ہی خوبصورت اسلوب میں بیان کرنا قابل تحسین ہے۔

آحمر لکھنوی جدید عہد میں جدید فلسفیانہ سوچ اور حقیقت پسند تجزیائی طرز وفکر کے مالک ہے۔ ان کی غزل میں جذبات واحساسات اور آرزو مندی کا احساس نہایت سادہ ہے۔ آحمر لکھنوی کے سارے افکار ورجحانات اکتسابی نہیں وہ متاثر ہو سکتے ہیں لیکن مقلد نہیں ہیں ان کی شاعری شعور جسم کی نہیں شعور روح (Soul Consciouness) کی ترجمانی کرتی ہے۔

اردو شاعری کی دنیا میں آحمر لکھنوی کا نام ایک پروقار اور مہذب شخصیت کا ہے۔ جس کو بہت کم لوگوں نے جانا لیکن جس نے ان کو جانا اس نے ان کی شاعری اور ان کی قلم کاری دونوں کو مانا۔ آحمر لکھنوی اپنی شاعری میں عشقیہ رنگ بھرنے کے بجائے دنیا کے درد کو سمویا ہے۔ انھوں نے شاعری میں اپنے عہد کے تمام سیاسی مذہبی، ثقافتی اور شعری تقاضوں کو برتا ہے۔ ان کی شاعری میں سوز وگداز اور لفظوں کو برتنے کا طریقہ بہت عمدہ ہے۔ دیوان آحمر لکھنوی کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ ان کی دلی کیفیت ہے یا اس میں زمانے کے حالات پوشیدہ ہے۔ آپ کی غزلیں اور نظمیں ہندوستان کے اخباروں میں چھپتی رہی ہیں۔

آحمر لکھنوی نے یوں تو غزل، نظم، نعت، مناجات، قصائد، سلام جیسی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے، مگر غزل گوئی سے ان کو زیادہ شغف تھا ان کے کلام میں ایمانی کیفیت پائی جاتی ہیں جس کی جھلک ان کی غزلوں میں صاف طور پر نظر آتا ہے۔ ان کا لہجہ عام انسانی جذبوں کو متاثر کرنے والا ہے۔

ان کی غزلوں میں گیرائی، جذبات واحساسات کی شدت کے ساتھ وسعت بھی نظر آتی ہے۔غزلوں کے مطالعے سے ان کی کیفیات کا پتہ چلتا ہے۔انھوں نے معاشرے کے درد وغم کو نہ صرف سمجھا بلکہ اس کو محسوس کیا اور اپنی باطنی کشمکش کو اشعار کے خوبصورت لہجے کے ذریعہ عیاں کر دیا۔چند شعر ملاحظہ ہوں:

وقت نے ترسا دیا ہے دانے دانے کے لئے
کتنا عبرت ناک عالم ہے زمانے کے لئے
ڈھونڈے جاتے ہیں بہانے ظلم ڈھانے کے لئے
ہیں سبھی جور وستم ہم کو مٹانے کے لئے

سب سے پہلے انکو بے رحمی سے پھونکا برق نے
چن کے جو لایا تھا تنکے آشیانے کے لئے

ہو رہی ہیں مدتوں سے سازشوں پر سازشیں
سرزمین ھند سے ہم کو مٹانے کے لئے

ہند میں رہنا ہے گر اصلاح اپنی خود کریں
ہے پیام احمر کا یہ مسلم گھرانے کے لئے
(دیوان احمر،ص۔۲۴۴)

احمر لکھنوی نے اپنی زندگی میں جو تجربات حاصل کئے تھے خواہ وہ ذاتی زندگی کے ہوں یا زمانے کی ابتری ،سماجی ،سیاسی مسائل ہو یا حالات کی افرا تفری ،اپنی شاعری میں انھوں نے اس کی حقیقی تصویر پیش کی ہے۔

احمر لکھنوی نے پختہ لہجے کی بے ساختگی کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے منفرد اور روشن نظام فکر وفلسفہ کو واضح ،سادہ اور موثر انداز میں سچائی اور بے تکلفی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ان کی فکر اور طرز اظہار میں مسلسل ارتقائی عمل کا جاری رہنا بہت اہم ہے۔وہ ایک ہی بار اور ایک ہی طرح کے ڈھلے ڈھلائے سامنے نہیں آئے بلکہ خوب سے خوب تر جستجو میں رہے ہیں۔

احمر لکھنوی نے اپنی غزلوں میں تشبیہ و استعارہ کو بھی خوبی سے برتا ہے۔احمر لکھنوی کے انوکھے استعارے مظاہر کی داخلی رشتوں کو ظاہر کرتے ہیں اور ان کی تشبیہات خاص طور پر بہت مختلف ومنفرد ہیں جنہیں ان کی قوت باطنی اور قوتِ تخیلہ نے نکھارا ہے۔

جان دی جن کے لئے وہ بھی بُرا کہتے ہیں
کشورِ حسن کا دستور یہ اُلٹا دیکھا

دھوپ سے گھبرا کے جس سائے میں ٹھہرا تھا کبھی
آج وہ سایا بھی میرا دشمنِ جاں ہو گیا

غم وآلام سے گھبرا کر آجاتا ہوں میخانے
یہیں رندوں سے ہو جاتی ہے کچھ دل بستگی اپنی

انھوں نے ایک مناجات بھی کہا ہے جس کا مطلع یوں ہے:

سزائیں مل چکیں عہد وفا کے بھول جانے کی
عطا کر اب ہمیں توفیق یارب در پہ آنے کی

یہ مطلع بظاہر سادہ ہے لیکن اپنے اندر کئی معنوی خوبیوں کو سمیٹے ہوئے ہے یہ انکی خیالات کی ندرت اور فنی بصیرت کی عمدہ مثال ہیں۔

احمر لکھنوی نے غزل کے ساخت میں اچھی نعت بھی کہی ہے غزل کے اشعار کے مابین بھی نعت کے اچھے اشعار نکالے ہیں۔ اس قبیل کے چند اشعار ملاحظہ ہیں:

عقیدہ تو پہلے ہی کوثر پہ تھا
پیا آبِ زم زم مزہ مل گیا

عنایت خدا کی ہے اے شاہِ دیں
جو دامن مجھے آپ کا مل گیا

مظالم ہو رہے ہیں اُمتِ محبوب پر تیرے
خدایا غیب سے اس کے لئے سامان پیدا کر

خارجی حقائق سے ہٹ کر ان کا کلام باطنی قوتوں سے لبریز ہے۔احمر نعت گوئی کے ایک عمدہ شاعر ہیں۔نعتیہ کلام کے علاوہ انھوں نے سلام بھی رقم کیا ہے۔

جان کے پروانہ کی دینِ محمد ﷺ کے لئے
کربلا میں ہو گئے قربان اکبرؓ دیکھنا

احمر لکھنوی نے نوحے ،نظمیں اور قطعات بھی تحریر فرمائے ہیں۔نوحے میں ان کا انداز جداگانہ ہوتا ہے ان کے نوحے کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ان میں حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے اپنے حسن کاری کو استعمال کیے بغیر نہیں رہ پاتے ہیں وہ فرماتے ہیں:

کیا کروں عرض کہ کہنے سے زباں ہے قاصر
ظلم میدان میں جو شاہ کے دل بر پہ ہوا

احمر لکھنوی کے نظموں کے مطالعے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نظم نگاری کے میدان میں پوری طرح کامیاب ہے وہ نظموں میں موضوع اور ماحول کے اعتبار سے ہم آہنگ الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ان کا لہجہ نرم ہوتا ہے اور یہ بڑے دھیمے لہجے میں دل کی آواز کو اجاگر کر جاتے ہیں۔جس طرح میر کی شاعری قاری کو رلاتی نہیں ہیں بلکہ زندگی کو مہذب طریقے سے جینے کا حوصلہ دیتی ہے،ٹھیک اسی طرح احمر لکھنوی کی شاعری ناامیدی نہیں بلکہ ایک حوصلہ ہے جو قاری کو امید وجستجو کے ساتھ آگے بڑھنے کی حوصلہ فراہم کرتا ہے اور عزائم کو بدرجہ اتم بلند کرتا ہے۔

ارادہ گر نہیں رکھتا ہے مجھ کو قید کرنے کا
تو پھر صیاد نے رکھی ہے کیوں زنجیر چٹکی میں
(دیوان احمر،ص۔۱۴۰)

دیوان احمر لکھنوی کے مطالعے کے درمیان میں نے محسوس کیا اور مجھے حیرت ہوئی کہ کوئی شخص بغیر بینائی کے دنیاوی کشمکش کو کیسے عیاں کر سکا۔ان کی غزلیں مختلف رنگ میں سامنے آتی ہے گویا محسوس ہوتا ہیں کہ ان کا شعور سب کچھ دیکھ رہا اور محسوس کر رہا ہے۔گویا لگتا ہے کہ ان کے باطن کا جمالیاتی شعور شعر کی شکل میں نکھر آیا ہے،اس شعور میں درد بھی ہے اور درد کا مداوا بھی۔

کتاب:

۱۔دیوان احمر لکھنوی،ڈاکٹر عمر غزالی،۲۰۱۳ ، انجلا گرافکس کولکاتا۔

☆☆☆

ڈاکٹر عبدالرشید ظہیری اور مُلّا شناسی

ڈاکٹر جگد مبا دوبے
(اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو حلیم مسلم پی جی کالج، کانپور Mob.9415280915)

پنڈت آنند نرائن ملا (۱۹۹۷۔۱۹۰۱) کا نام ہمارے شعروادب کی جدید تاریخ میں بڑے احترام سے لیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ نہ صرف ان کی فکر کا سلجھاؤ تھا بلکہ وہ کمال کے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ زبان کی ترقی کے لئے بھی ہمیشہ کوشاں رہا کرتے تھے۔ جۓ پور میں منعقدہ ایک جلسے میں صدارتی تقریر کرتے ہوئے انھوں نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ''اردو میری مادری زبان ہے، میں مذہب چھوڑ سکتا ہوں لیکن مادری زبان نہیں'' (سہ ماہی اردو ادب دہلی، آنند نرائن ملا نمبر ص ۷، مرتبہ: خلیق انجم، سن اشاعت ۱۹۹۴)۔ الٰہ آباد ہائی کورٹ کے ایک جج کی حیثیت سے بھی اور آگے لوک سبھا کے آزاد رکن کے طور پر بھی اردو سے والہانہ عشق کا برابر اظہار کیا۔ لیکن ہمارے یہاں ملّا کی قدر شناسی کی کبھی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی۔ ۱۹۹۴ میں خلیق انجم کے مرتبہ سہ ماہی اردو ادب کے خاص نمبر کو چھوڑ دیا جائے تو بالعموم ملّا کی طرف ناقدین کی توجہ نہیں گئی۔ اس کمی کو اردو تحقیق کے عظیم محسن پروفیسر محمود الٰہی نے محسوس کیا اور انھوں نے اپنے لائق شاگرد عبدالرشید ظہیری کو ملّا پر تحقیقی کام انجام دینے کے لئے راضی کر لیا۔ پھر کیا تھا، اپنی نگرانی میں انھوں نے عبدالرشید ظہیری سے ملّا پر ایسا ٹھوس کام لیا کہ اب تک ملّا شناسی پر عبدالرشید ظہیری کو سند کی حیثیت حاصل ہے۔ گمنام رہ کر بھی ملّا کی خدمات کو اجاگر کرنے والے عبدالرشید ظہیری کون تھے؟ یہ جاننا اردو تحقیق کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے قارئین کے لئے سودمند ہوگا۔

ڈاکٹر عبدالرشید ظہیری میرے استاد تھے لیکن تعلقات باہمی میں جس نوعیت کی قربت ومحبت تھی اس سے ہم رفیق اور دوست زیادہ ہو گئے تھے۔ ان کی پیدائش ۱۳/اکتوبر ۱۹۵۷ کو موضع خانساماٹولہ، پوسٹ ہتھواضلع گوپال گنج بہار میں ہوئی تھی۔ ان کے والد کا نام مولوی محمد ظہیرالدین تھا۔ ان کی پیدائش بھلے ہی بہار میں ہوئی تھی لیکن ان کا مستقل پتہ خونی پور، گورکھ پور تھا۔ ان کی شروعاتی تعلیم فاضل، کامل عربی فارسی مدرسہ بورڈ سے پوری ہوئی۔ بی اے شبلی کالج اعظم گڑھ سے کیا اور اردو میں ایم اے گورکھپور یونیورسٹی سے کیا۔ اس کے بعد پروفیسر محمود الٰہی کی نگرانی میں ''پنڈت آنند نرائن ملا؛ حیات اور شاعری'' پر گورکھ پور یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی مکمل کیا۔ شروعاتی تعلیم مدرسہ کی ہونے کی وجہ سے زبان پر اچھی پکڑ تھی۔ ایک سنجیدہ استاد ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سنجیدہ اسکالر بھی تھے۔ ان کی اسی صلاحیت کی بنیاد پر ان کی تقرری ۲۰/دسمبر ۱۹۹۶ کو شری گاندھی پی جی کالج، مالٹاری، اعظم گڑھ کے شعبۂ اردو میں بطور استاد ہوئی۔

کم بولنا اور زیادہ سننا ان کی زندگی کا اصول تھا۔ موٹے لینس کا چشمہ اور ہلکی داڑھی میں جب کالج میں داخل ہوتے تھے تو شعبۂ اردو میں رونق آجاتی تھی۔ ہر ایک شاگرد سے ان کا گہرا لگاؤ ہوتا تھا اور ان کی ہر وقت مدد کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ چونکہ ان کا بچپن اور طالب علمی کا دور بے حد

غریبی میں گزرا تھا اس لیے انھیں اس کا اچھی طرح اندازہ تھا اور نہ جانے کتنے غریب بچوں کی فیس وہ خود جمع کر دیتے تھے اور کتابوں کی سہولت کے لئے بھی ان کی مدد کرتے تھے۔ زندگی کو سادگی کے ساتھ ساتھ گزارتے تھے۔ دوست کم ہوتے تھے لیکن جتنے ہوتے تھے وہ بے حد خاص ہوتے تھے۔

مجھے یاد ہے جب میں نے شری گاندھی پی جی کالج، مالٹاری، اعظم گڑھ میں تعلیم کے لئے داخلہ لیا تھا تو میری ملاقات استاد محترم عبدالرشید صاحب سے پہلی بار ہوئی تو میں کافی متاثر ہوا اور انھوں نے کافی مدد بھی کی۔ چونکہ ان کے شب و روز خود ہی بڑی پریشانیوں میں گزرے تھے اس لیے انھیں دوسروں کی پریشانی کا احساس تھا۔ وہ بڑھ چڑھ کر طلبہ اور دوستوں کی مدد کرتے۔ اس کے باوجود علمی کاموں میں مصروف رہتے۔ ان کی اس خوبی کی تعریف کرتے ہوئے پروفیسر محمود الٰہی لکھتے ہیں:

''مجھے ذاتی طور پہ اس بات کا علم ہے کہ عبدالرشید صاحب کے شب و روز بڑی پریشانیوں میں گزرے لیکن ان کو اس کا علم ضرور ہوگا کہ پریشانیاں علمی کاموں میں سدراہ نہیں بنتیں''۔

یہ سچ ہے کہ پریشانیاں کبھی علمی کاموں میں سدراہ نہیں بنتیں جس کی مثال خود عبدالرشید صاحب تھے کہ بے حد غریبی میں پلے بڑھے لیکن اپنی محنت اور ذہانت سے مدرسے کی مدرسی سے ڈگری کالج کے استاد بننے تک کا سفر کیا۔ اردو ادب کے علاوہ فارسی ادب پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ پروفیسر احمر لاری ان کی کتاب ''پنڈت آنند نرائن ملاّ: حیات اور شاعری'' (۱۹۹۹) کے تعارفیہ میں لکھتے ہیں کہ:

ڈاکٹر عبدالرشید ظہیری اردو ادب کے علاوہ فارسی ادب پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ ان کے متعدد تحقیقی اور تنقیدی مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ زیر نظر مقالے میں انھوں نے ایک محقق کی علمی دیانت داری اور غیر جانبدارانہ روش کو ملحوظ رکھتے ہوئے ملاّ صاحب کی شخصیت اور ان کے شعری و ادبی اکتسابات کا تنقیدی محاکمہ کیا ہے۔ اس طرح انھوں نے ملاّ پرستی کی نہیں، ملاّ شناسی کی راہ ہموار کی ہے''۔

ڈاکٹر عبدالرشید ظہیری نے اپنے اس تحقیقی مقالے کو چھ ابواب میں تقسیم کیا تھا۔ پہلا باب میں ملاّ کے نقوش حیات، قانونی، سیاسی، سماجی ادبی، اور اردو خدمات کا احاطہ کیا تھا، دوسرے باب میں ۱۸۵۷ کے بعد ابھرنے والی علی گڈھ تحریک اور اس کے بعد رومانوی تحریک، ترقی پسند تحریک اور آزادی کے بعد ان تحریکات کے زیر اثر ظہور میں آنے والی جدید شاعری کا اجمالی جائزہ لیا تھا۔ تیسرے باب میں ملاّ کے عہد کا سیاسی اور ادبی پس منظر لکھنؤ کا ادبی ماحول، ملاّ کے معاصرین کے اثرات کو بیان کیا تھا۔ ملاّ کے شاعرانہ مقام کے تعین کی کوشش کی تھی، چوتھے باب میں ملاّ کی غزلوں کا تنقیدی تجزیہ پیش کیا تھا اور پانچویں باب میں ملاّ کی نظم نگاری اور رباعی گوئی کا تفصیلی جائزہ پیش کیا تھا۔ اس باب میں ملاّ کی قومی، شخصی، سماجی اور رومانی نظموں پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے عبدالرشید ظہیری نے ملاّ کے خیالات کی توضیح وتشریح کرنے کی کامیاب کوشش کی تھی۔ اور آخر میں چھٹے باب میں ملا کی نثری تخلیقات کا مبسوط جائزہ پیش کیا تھا جس سے ملاّ شناسی کا افق روشن تر ہو گیا اور عبدالرشید ظہیری کا نام ملاّ کے ساتھ ہمیشہ ہمیش کے لئے جڑ گیا۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عبدالرشید ظہیری کسی بھی تحقیقی کام کو کس قدر سنجیدگی اور دلجمعی کے ساتھ انجام دیا کرتے تھے۔

راقم کے علم کے مطابق عبدالرشید صاحب نے شادی نہیں کی تھی اور اکیلے ہی کرایے کے گھر میں قصبہ جین پور اعظم گڑھ میں رہتے تھے۔ شروع سے ہی صحت سے بہت اچھے نہیں تھے۔ کتابوں سے کافی دلچسپی رکھتے تھے اور چاہتے تھے کہ ان کے سبھی طالب علم بھی کتابوں کو پڑھنے کا شوق رکھیں۔ خود وقت کے بے حد پابند تھے اور چاہتے تھے کہ دوسرے بھی وقت کے پابند ہوں۔ درس وتدریس ہی ان کا پیشہ تھا۔

کورونا کی دوسری لہر بے حد خوف ناک طریقے سے ملک میں داخل ہوئی اور قہر برپا کر گئی۔ اسی کورونا کی دوسری لہر نے ۲۴ راگست ۲۰۲۱ کو انھیں ہم سب سے ہمیشہ کے لیے چھین لیا۔ اردو ادب کی تاریخ میں اب تک کا یہ سب سے برا دور تھا۔ ایک کے بعد ایک اردو ادب کی بڑی ہستیوں کا اتنی بڑی تعداد میں دنیا سے رخصت ہونا یقیناً تاریخ ادب اردو کا ایک بہت بڑا خسارہ ہے۔ آج ہمارے بیچ عبدالرشید ظہیری صاحب نہیں ہیں لیکن ان کی شفقت آمیز باتیں، اردو کی بے لوث خدمات اور انسان دوستی ایک عرصہ تک آسمان ادب پر چھائی رہیں گی اور اردو ادب کی اہمیت وعظمت کا اعتراف کرتی رہے گی۔ ☆☆☆

ضیابارافراد کے خطوط بنام اصغرعباس: ایک مطالعہ

ڈاکٹرشکیل احمد

(ڈومن پورہ، چنگی، مئوناتھ بھنجن، ۲۷۵۱۰۱، یوپی Mob: 9236722570)

کتاب کے نام سے ظاہر ہے کہ زیرتجزیہ کتاب ان خطوط کا مجموعہ ہے جو کئی دہائیوں کے دوران پروفیسر اصغرعباس صاحب شعبۂ اردو علی گڑھ کے نام بقول مرتب ''ضیابار'' افراد نے بھیجے ہیں۔ ابتدائی صفحات میں ''شروع کی بات'' کے عنوان سے موصوف نے دل چسپ اور مفید معلومات فراہم کی ہیں:

''میرے پاس نجی خطوط کا ذخیرہ تقریباً دس کلو وزن پر مشتمل گوشۂ خمول میں پڑا ہوا تھا۔ عالمی وبا کے دوران جب میری فطری آزادی مفقود ہوگئی تو میں نے اس ذخیرہ کو کھنگالنا شروع کیا، یہ خطوط ۱۹۶۹ سے ۲۰۱۰ء کے درمیان مکتوب الیہ کو لکھے گئے ہیں۔ اب انہیں دوبارہ پڑھ رہا ہوں تو بھولی بسری یادیں تازہ ہورہی ہیں۔ ان میں اردو کی ثقافتی زندگی کی ساری گہما گہمی موجود ہے۔ مکتوب نگاروں کے چہرے جانے پہچانے ہیں۔ اس میں شامل بیشتر وہ خطوط نگار شامل ہیں جن کا اوڑھنا بچھونا اردو زبان وادب ہے۔ اسی لئے ان مکاتیب کے عناصر ترکیبی میں اردو کی ثقافتی زندگی کی نمود ہے'' (صفحہ ۹-۱۰)۔

چار سو ستر سے زیادہ صفحات پر مشتمل یہ کتاب جس کے آخر میں تصاویر کے ساٹھ صفحات الگ سے شامل کئے گئے ہیں۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ کے توسط سے ۲۰۲۰ء کے اواخر میں مرتب نے خاصے اہتمام سے شائع کی ہے۔

پروفیسر اصغرعباس صاحب شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے وابستہ رہے ہیں آپ نے سبک دوش ہونے تک اس شعبہ میں کئی حیثیتوں سے کام کیا اور اپنی کارکردگی کے نمایاں نقوش چھوڑے ہیں۔ آپ کی گراں قدر تصانیف اور مرتب کردہ کتابوں کی تعداد درجن بھر سے زیادہ ہے۔ یہ تازہ کتاب آپ کے ادبی قد وقامت اور دائرہ کار کا بھی تعارف کراتی ہے۔ ان میں بقول مرتب چالیس برس کے دوران ان کے نام آنے والے خطوط کو مکتوب نگار کے الف بائی ترتیب سے نام درج کرکے شائع کیا گیا ہے۔

اردو کی ادبی اصناف میں مکتوب نگاری کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔ ''مکاتیب غالب'' اس کی نمائندگی کرتے ہیں۔ بہت سارے مشاہیر کے خطوط بشمول ''مکاتیب شبلی'' اردو زبان وادب کا قیمتی اثاثہ ہیں۔ غالبؔ وشبلیؔ کے مکاتیب تو دوسرے کے نام لکھے گئے اور ان کو ارسال کئے گئے تھے ''ضیابارافراد کے خطوط'' میں پروفیسر اصغرعباس صاحب کے نام آنے والے خطوط شامل ہیں۔ اول الذکر سے غالب وشبلی کے حلقہ وادب اور اندازِ نگارش کا علم ہوتا ہے۔ اور مؤخرالذکر کتاب سے اصغرعباس صاحب کے ادبی قد وقامت اور تصنیفی دائرہ کار کا پتہ چلتا ہے۔ قابل ستائش ہیں مرتبِ کتاب ''ضیابار'' کہ موصوف نے گزشتہ نصف صدی کے دوران اپنے نام آنے والے ''ضیابارافراد'' کے خطوط کو بہ حفاظت سجوئے رکھا اور وقت آنے پر (کرونا لاک ڈاؤن) میں خانہ قید ہونے کے بعد ان کی ترتیب دے کر اپنے صرفے سے شائع بھی کرادیا۔ اس مجموعۂ مکاتیب میں ایک سو چھیالیس حضرات کے

کل پانچ سو چھتیس خطوط شامل ہیں۔ ایک سو چھیالیس میں سے چونسٹھ حضرات کے صرف ایک خط شامل اشاعت ہیں۔ بقیہ حضرات کے ایک سے زائد۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ مکتوب نگار حضرات کے مکتوب الف بائی ترتیب سے دیئے گئے ہیں لیکن موصوف نے اپنے والد محمد علی عباس اور اہلیہ انیس فاطمہ کے اکلوتے خط کو بالکل اخیر میں صفحہ ۴۱۱ اور ۴۱۲ پر شائع فرمایا ہے۔ اور ان دونوں مرحومین کے ایک ایک خط پر کتاب مکمل ہوتی ہے اور اس کے بعد ساٹھ صفحات پر مشتمل تصاویر نہایت عمدہ اور روشن کاغذ پر شائع ہوئی ہیں۔ کتاب کے مطالعہ سے متعدد دل چسپ باتیں سامنے آئی ہیں۔ جیسے شمس الرحمٰن فاروقی کے سب سے زیادہ چالیس خطوط شامل ہیں لیکن چالیس خطوط نے کتاب کے صرف پندرہ صفحات لئے ہیں کیونکہ بیشتر خطوط بہت مختصر یعنی دو سے چار اور بعض آٹھ دس سطر پر محیط ہیں۔ اس کتاب کا سب سے مختصر خط یوں ہے:

'عزیزی اصغر عباس! لکچرر ہونا مبارک ہو، اب میرا حلقہ West سے بدل کر سنٹرل ہوگیا ہے۔ ورنہ اب تک بہ نفس نفیس مبارک باد دینے کے لئے آتا۔ خدا تم کو خوش رکھے۔''

تمہارا

شمس الرحمٰن فاروقی صفحہ ۲۰۷

سب سے طویل شہاب الدین ثاقب کے خطوط ہیں جو تعداد میں سات ہیں اور ان سات خطوط نے کتاب کے گیارہ صفحات کو گھیر رکھا ہے۔ دو خطوط تو ڈھائی، ڈھائی صفحات پر مشتمل ہیں۔ اور یہ بتانے کی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ کس قدر تفصیلی ہوں گے۔ ترتیب کی رو سے سب سے پہلے آل احمد سرور صاحب کے سترہ خطوط شائع کئے گئے ہیں اور یونس اگاسکر صاحب کے چار خطوط اخیر میں، اور ان سب کے بعد پروفیسر اصغر عباس صاحب نے اپنے والد محمد علی عباس صاحب کا ایک اور اس کے بعد اہلیہ انیس فاطمہ کا ایک خط شائع کیا ہے۔ جو بالترتیب گورکھ پور اور دیوریا سے لکھے گئے ہیں۔ جو ظاہر ہے ذاتی نوعیت کے تو ہیں مگر والد اور اہلیہ دونوں نے اپنے اپنے طور پر اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔

اس مجموعۂ مکاتیب ''ضیا بار افراد کے خطوط'' میں اساتذہ، احباب، اہل علم، شاگرد اور برصغیر بلکہ دنیا کے متعدد ملکوں میں پھیلے ہوئے اردو کے اساتذہ، قلم کار اور اہل علم کے خطوط شامل ہیں ہر مکتوب نگار کا انداز تحریر اپنا ہے اور ایک دوسرے سے خاصا مختلف بھی ہے اس لئے تمام خطوط کے مطالعہ کے دوران بار بار نئے نئے مناظر اور معاملات سے روبرو ہونے کا موقع ملتا ہے جس کے باعث یک رنگی کا سوال ہی نہیں اٹھتا اور قاری ہر خط بلکہ ہر صفحہ پر کچھ نیا اور الگ پڑھ کر بار بار بدلتے ماحول کا احساس کرتا جاتا ہے۔ اس کے ذہن کے دریچے میں کئی رنگ اور کئی منظر روشن ہوتے رہتے ہیں۔

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے ایک سو چھیالیس حضرات کے خطوط اس مجموعۂ مکاتیب میں شامل ہیں۔ ہر ایک کا نام نہ گنایا جاسکتا ہے اور نہ اس بابت کوئی تفصیل محدود صفحات میں پیش کی جاسکتی ہے۔ لیکن مختلف حضرات کے منتخب خطوط سے کچھ حصے ضرور نقل کئے جاسکتے ہیں جس کے مطالعہ سے گزشتہ نصف صدی کے دوران ادبی اور علمی حلقوں اور افراد کی سرگرمیوں اور باہمی تعلقات کا علم ہماری معلومات میں اضافے کا سبب ضرور بن سکتا ہے۔ اس سے قبل یہ عرض کرتا چلوں کہ ہر مکتوب نگار کے بارے میں بطور تعارف خط والے صفحہ پر نیچے، چند سطریں اس طور پر تحریر فرمائی ہیں جس سے قاری کو مکتوب نگار سے متعارف ہونے میں آسانی ہوجاتی ہے بہ ظاہر یہ آسان سا کام لگتا ہے لیکن قاری کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس کے علم میں اضافہ یا کم از کم اجنبیت دور کرنے کا ذریعہ بن گیا ہے مثال کے طور پر صفحہ ۲۸۲ پر پروفیسر عبدالستار دولوی کے بارے میں یہ سطریں لکھی گئیں:

''مہاتما گاندھی ریسرچ سنٹر، ممبئی کے بانی، شعبۂ اردو بمبئی یونیورسٹی میں اردو کے بانی صدر و پروفیسر، مصر کی عین شمس یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے بانی صدر، انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، بمبئی کے ڈائرکٹر، ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، پونے کے ڈائرکٹر، اردو زبان و ادب کے ممتاز محقق''۔

بے حد مختصر لفظوں میں صفحہ ۶۹ پر پروفیسر جمیل اختر کا تعارف پیش کرتے ہیں:

''پروفیسر شعبۂ اردو کراچی یونیورسٹی، متوطن رام پور، یوپی، پروفیسر محمود الٰہی کے رام پور میں شاگرد''۔

کتاب میں شامل خطوط کے توسط سے ادبی ماحول کا اندازہ تو ہوتا ہی ہے، اصغر عباس صاحب کی ذاتی زندگی سے متعلق بھی بہت سی باتیں سامنے آجاتی ہیں قمر الزماں مبارک پوری کے جو دو خط صفحہ ۳۱۸ اور ۳۲۰ پر شائع ہوئے ہیں ان کے خط میں پوچھے گئے سوال

جواب میں حاشیے پر لکھتے ہیں۔

''میرا وطن مالوف قصبہ بی بی پور ضلع اعظم گڑھ، اب ضلع مئو ہے۔ اب سے ڈیڑھ دوسو برس پہلے ممتاز انگریز محقق اور عالم H.R. Nevill نے صوبہ آگرہ اور اودھ کے اضلاع کا گزیٹیر تیار کیا تھا۔ ضلع اعظم گڑھ کے گزیٹیر میں صفحہ ۹۳ پر لکھا ہے کہ ''قصبہ بی بی پور ضلع اعظم گڑھ کے شیوخ میزبانِ رسولؐ حضرت ابوایوب انصاریؓ کے نسبی سلسلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس نے اس گزیٹیر میں میرے جدامجد کا نام بھی لکھا ہے۔ میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں میرے اجداد بخارا سے آئے تھے۔''

(اصغر عباس)

دوسرے خط کے ایک استفسار کے جواب میں حاشیے میں مزید لکھتے ہیں:

'بی بی پور کے جن حاجی محمد صدیق کا یہاں ذکر ہے وہ میرے پردادا تھے۔ حکیم برہم کے اخبار مشرق، گورکھپور کے شمارہ نمبر ۳۹ جلد ۴۱، مؤرخہ ۲۳ ستمبر ۱۹۲۰ء میں یہ خبر چھپی ہے کہ قصبہ بی بی پور، تحصیل گھوسی، ضلع اعظم گڑھ کے قاضی محمد صدیق نے دس ستمبر کو ڈھائی بجے دن میں ۸۹ برس کی عمر میں دنیا سے مفارقت فرمائی جنازے کے ساتھ اتنا مجمع تھا کہ اس گاؤں میں ایسا مجمع شاید ہی کبھی ہوا ہو۔''

(اصغر عباس)

مذکورہ اہم معلومات کے علاوہ اس کتاب میں شامل خطوط سے مزید کئی باتیں پروفیسر اصغر عباس صاحب اور ان کے کنبے سے متعلق معلوم ہوجاتی ہیں۔ ایک خط جو ۷ اپریل ۱۹۸۴ء کو گورکھ پور سے لکھا گیا جس میں بیگم اصغر کے ایک روز کی تاخیر سے علی گڑھ پہنچنے کی اطلاع دی جارہی ہے:

''رفعت ۱۰ کو جانے والی تھیں مگر Reservation نہ ہوسکا، ۱۱ کو یعنی اتوار کی شام کو گورکھ پور سے روانہ ہوکر دوشنبہ کو انشاء اللہ علی گڑھ پہنچیں گی وہ دلہن (بیگم اصغر عباس) کے ہمراہ جائیں گی ..... میں نے مناسب سمجھا کہ تم کو اطلاع دے دوں کہ جب اتوار کو دلہن نہ پہنچیں گی تو تم کو پریشانی ہوجائے گی۔'' صفحہ ۱۱۴۔

اسی نوعیت کا خط انیس فاطمہ (بیگم اصغر عباس) کا صفحہ ۱۱۲ پر تحریر کیا گیا۔ دیوریا سے ۲۰ دسمبر ۱۹۸۸ کو تحریر کئے گئے خط کے ابتدائی جملے ملاحظہ ہوں:

پیارے دوست، السلام علیکم

''خدا کرے آپ خیریت سے ہوں، اللہ کے شکر سے ہم لوگ بخیریت پہنچ گئے، ابا جان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ دل بہت پریشان ہے۔ خدا کرے جلد ٹھیک ہوجائیں۔ عبداللہ ٹھیک ہیں۔''

اصغر عباس کی ذاتی زندگی کے اہم واقعہ سے متعلق خواجہ مسعود علی ذوقی صاحب، ۲۲ جولائی ۱۹۷۴ء کو تحریر فرماتے ہیں:

دعوت نامہ ملا، اپنی خانہ آبادی کی بہت بہت مبارک باد وصول کرو، اللہ تعالیٰ تم دونوں کو نئی زندگی کی بھرپور مسرتوں اور کامرانیوں سے سرفراز فرمائے، اپنے والد کی خدمت میں بھی میری مبارک باد پہنچا دینا۔'' صفحہ ۱۱۳

اصغر عباس صاحب کے شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں لکچرر مقرر ہوجانے کے موقع پر شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کی مبارک باد کے مختصر خط کا ذکر کرچکا ہوں۔ اب آپ کے شعبۂ اردو میں ریڈر مقرر ہوجانے کے موقع پر پروفیسر شمیم حنفی صاحب کے تہنیتی خط کو نقل کررہا ہوں جس پر تاریخ درج نہیں ہے:

برادرم اصغر عباس صاحب

سلام علیک

کئی روز پہلے خبر مل گئی تھی کہ ریڈرشپ پر آپ کا تقرر ہوگیا ہے اور ہم سب اس خبر سے بے حد خوش ہوئے تھے۔ جی چاہا کہ خط لکھوں، اسی دوران وہ وبائی بخار جس نے آدھی دلی کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے، ہمارے گھر بھی پہنچ گیا۔ میں اور صبا دونوں بیمار تھے بخار تو گیا، نشہ باقی ہے اور اس نشے نے بہت ہلکان کررکھا ہے۔ سخت کمزوری اور بے مرگی۔

اب علی گڑھ آؤں گا تو باقاعدہ جشن ہوگا۔

آپ کا شمیم حنفی صفحہ ۲۲۶

اس مجموعۂ مکاتیب میں معاملات وتعلقات کی ایک دنیا آباد نظر آتی ہے۔ کتنے خطوط کا ذکر کیا جائے پروفیسر اصغر عباس صاحب کی ادبی اور تصنیفی نیز شعبہ جاتی سرگرمیوں کے ساتھ اس دور کے مشاہیر کے کوائف، انداز تحریر اور ادبی معیار ومرتبے کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ تحقیقی اور تصنیفی کاموں میں علمی شخصیات کس طور پر ایک دوسرے کے کام آتی ہیں، بے لوث انداز میں تعاون پیش کرتی ہیں۔ علمی تحائف سے نوازتی ہیں، کن الفاظ اور خوبصورت جملوں میں شکریہ ادا کرتی ہیں یہ چیزیں ہمارے لئے سیکھنے اور تربیت پانے کے مواقع فراہم کرتی

ہیں، آج جب مکتوب نگاری حاشیے پر جا چکی ہے۔ ای، میل اور واٹس ایپ باہم مراسلت کا ذریعہ بن چکے ہیں پھر بھی اس مجموعۂ مکاتیب میں شامل، ضیابارا فراد کے خطوط یہ دعوت دیتے ہیں کہ ان کا نہ صرف مطالعہ کیا جائے بلکہ اپنی توفیق اور بساط کے مطابق اس سے بھر پور استفادہ بھی کیا جائے، مختلف مواقع جس کی وضاحت خطوط کے مطالعہ سے ہوجائے گی اور اس سے متعلق جو اندازِ تحریر مکتوب نگار حضرات نے اختیار کیا ہے، اس سے قاری کو اردو کی تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیوں کو سمجھنے اور اس سے حظ اٹھانے کا گراں قدر موقع بھی ملے گا۔

اگلی سطور میں چند مکتوب نگار اور ان کے خطوط کے قابل ذکر حصے کو نقل کر رہا ہوں جو یقیناً ہماری معلومات میں اضافہ کا باعث ہوں گے اور جن کی مدد سے اردو دنیا کے مشاہیر کے طرز تخاطب اور اندازِ کار کا بھی اندازہ ہو سکے گا۔

کتاب کے صفحہ ۳۴ پر پروفیسر اسلوب احمد انصاری کا خط ملاحظہ فرمائیں:

گل افشاں، سول لائنز، دودھ پور
علی گڑھ، مورخہ ۲۵ ستمبر ۸۵ء
وقت ۷ بجے شب

مکرمی اصغر علی عباس صاحب!
السلام علیکم

آج صبح پروفیسر ڈاکٹر پرتاپ سنگھ یہاں آئے تھے، شام کو مجھ سے ملنے آئے ہم دونوں آپ کے گھر پہنچے۔ وہاں تالہ لگا ہوا تھا۔ پڑوسی سے معلوم ہوا کہ آپ کے والد صاحب کے اچانک انتقال کی خبر پر آپ گھر چلے گئے۔ بہت افسوس ہوا۔ آپ کو جو صدمہ ان کے انتقال سے پہنچا ہو گا۔ اس کا اندازہ لگانا دل آسان نہیں۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت کرے اور آپ کو صبر کی ہمت دے کہ اس صدمۂ عظیم کو برداشت کر سکیں، اپنے غم میں مجھے بھی اپنا شریک سمجھیں۔

خیر اندیش
اسلوب احمد انصاری

پروفیسر آفاق احمد، بھوپال کے خط کی وہ سطریں نقل کر رہا ہوں جو انہوں نے بیگم اصغر عباس کے انتقال کے موقع پر لکھیں اور جس کے الفاظ اظہار تعزیت کے لئے بہتوں کے کام آسکتے ہیں:

''گل کدہ'' ۸ عیدگاہ ہلز
بھوپال، ۲۴ مئی ۲۰۰۹ء

برادرِ عزیز اصغر عباس صاحب

کاش میں علی گڑھ پہنچ پاتا اور وہاں پہنچ کر آپ کو پرسہ دیتا اور آپ کے ساتھ غم بانٹتا۔ آج تک میرے کانوں میں آپ کا وہ جملہ گونج رہا ہے کہ ''قصہ تمام ہوا'' میرے بھائی، موت پر کس کا بس چلا ہے۔

نہ میں جاودانی، نہ تو جاودانی
ازل کے مصور کا ہر نقش فانی

مرحومہ کا بلاوا آچکا تھا، کم از کم آپ کے لئے یہ اطمینان کیا کم ہے کہ آپ نے اپنے طور پر ان کو صحت یاب دیکھنے کے لئے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی .... مجھے آپ کے غم کا احساس ہے ..... تنہائی کا احساس بڑا جان لیوا ہے۔ لیکن بھائی صاحب! ہمارے آپ کے ہاتھ میں کیا ہے۔ صبر کیجئے کہ صبر کا بڑا اجر ہے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ خدا آپ کو اس صدمے کو برداشت کرنے کا حوصلہ دے .... خدا مرحومہ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔''

آپ کا بھائی
آفاق احمد صفحہ ۲۰

احمد جمال پاشا کا ایک خط نقل کر رہا ہوں جس سے کسی طنز و مزاح نگار کی مکتوب نگاری سے لطف اندوز ہونے کا موقع تو ملے گا ہی یہ بھی اندازہ ہو جائے گا کہ پروفیسر رشید احمد صدیقی پر پروفیسر اصغر عباس صاحب ایک خاص نمبر شائع کرنا چاہتے ہیں اس کے بارے میں احمد جمال پاشا اپنا قلمی تعاون اور دیگر حضرات سے مضمون لکھوانے کی بابت کیسے مشورے پیش کرتے ہیں۔

نشاط افزا، سیوان
۱۵ اگست ۱۹۷۷ء

کرم فرمائے من
السلام علیکم

.... ''خنداں'' پر مقالہ تقریباً تیار ہے، بھلا علی گڑھ کا سکٹ کھانے کے بعد کون آخر ہو گا جو رشید صاحب پر مضمون نہ لکھے گا ..... میرا مضمون طویل ہو گیا ہے میرا اندازہ ہے کہ ۲۵ فل اسکیپ تک جائے گا ..... میرے خیال میں ہندوستان پاکستان کے سوا اہل قلم کو دعوت دیجئے، ایک رجسٹر بنا لیجئے اور ہر ہفتہ دو ہفتہ پر ریمائنڈر بھیجتے رہئے۔ پندرہ بیس لکھ دیں گے ..... کچھ مرحوم کے خطوط یا ان کی نقلیں حاصل کر لیجئے .اور آخر میں رشید صاحب کا ایک اچھا سا انتخاب شامل کر لیجئے....

آپ کا
احمد جمال پاشا صفحہ ۲۶

دل چسپ انداز اور دل کش پیرایہ میں ایک خط کی چند سطریں نقل کر رہا ہوں جو افتخار احمد عدنی صاحب کا تحریر کردہ ہے اور جن کے تعارف میں اصغر عباس بتاتے ہیں کہ آپ سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نواب محمد اسمٰعیل خان کے بیٹے اور نواب محمد اسحاق خاں سکریٹری مجلس منتظمہ علی گڑھ کالج کے پوتے اور فارسی کے مشہور شاعر شیفتہ کے پڑپوتے اور انگریزی میں غالب کی غزلوں کے مترجم ہیں۔

اصغر عباس صاحب

....اب آپ کو یہ زحمت دے رہا ہوں کہ برائے مہربانی وہ خط جو میں نے نذیر احمد صاحب کو بھیجا تھا ''قومی زبان'' کے پرچے کے ساتھ انہیں پہنچا دیجئے، دوسری زحمت یہ دے رہا ہوں کہ مشفق خواجہ صاحب کی رائے پر عمل کرتے ہوئے ..... دو خط ڈاکٹر مختار الدین احمد اور اسلوب احمد انصاری کے نام ہیں بمعہ دو کتابوں اور رسالوں کے بھیج رہا ہوں ..... مجھے شرمندگی ہے کہ آپ کو اتنی زحمت دے رہا ہوں لیکن زحمت تو دی جاتی ہے نیک اور شریف آدمیوں کو، اس میں میرا قصور کم اور آپ کی شرافت کا زیادہ ہے۔

..... چند مہینے پہلے آپ نے سید حامد صاحب پر ایک مضمون لکھنے کا مطالبہ کیا تھا۔ اس وقت تک میری ان سے سرسری ملاقات تھی وہ اتنے اچھے آدمی ہیں کہ انہوں تعلیم آباد میں میرے قیام کا انتظام کر کے اپنی میزبانی سے مجھے نوازا اور اس سرسری ملاقات کو دوستی میں تبدیل کر دیا۔ اب میں ان پر کچھ لکھ سکتا ہوں اور انشاءاللہ ضرور لکھوں گا۔''

نیاز کیش

افتخار احمد عدنی صفحہ ۳۶

اردو کی ادبی تاریخ کے بارے میں ایک خط کا نقل کر دینا مناسب سمجھتا ہوں جسے افضل الدین اقبال سابق پروفیسر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی، حیدر آباد نے یکم جولائی ۱۹۹۷ء کو اصغر عباس صاحب کے نام لکھا:

مکرمی ڈاکٹر صاحب

تسلیم

آپ کا خط ملا، ..ایسٹ انڈیا کمپنی نے کلکتہ میں جس طرح فورٹ ولیم کالج قائم کیا تھا اسی طرح، اسی زمانے میں انگریزوں نے

مدراس میں بھی فورٹ سینٹ جارج کالج قائم کیا تھا۔ اس کالج نے اردو زبان خصوصا دکنی زبان وادب کی نشر واشاعت اور توسیع میں بڑا حصہ لیا ہے . اردو کا طالب علم اور بہت سارے اسکالرس فورٹ سینٹ جارج کالج (مدراس) کی خدمات سے بالکل ناواقف ہیں اس موضوع پر بھی میں لکچر دے سکتا ہوں۔''

آپ کا

افضل الدین اقبال صفحہ ۳۸

اردو شعرا اور قلم کاروں کے بارے میں اکثر یہ تکلیف دہ واقعہ پڑھنے اور سننے میں آتا ہے کہ ان کا کلام، نگارشات، مقالے یا کتابیں دست بردِ زمانہ کی نذر ہوگئیں۔ تلف ہوگئیں یا کسی نے خرد برد کر دیا یا خود اپنی کوتاہی اور بے توجہی کے باعث ضائع ہوگئیں ایسے کچھ واقعات کا علم سید حامد صاحب کے مکتوب سے ہوتا ہے۔ صفحہ ۱۵۸ پر شائع خط میں پروفیسر اصغر عباس صاحب کو لکھتے ہیں:

ہمدرنگر، نئی دہلی

۱۴/جنوری ۱۹۸۷ء

عزیز گرامی قدر

یکم فروری کو ان شاءاللہ آپ سے ملاقات ہوگی۔ آپ نے فراخ دلی کے ساتھ میری کتابوں کی پذیرائی کی یہ تین کتابیں دراصل چالیس سال کی کمائی ہے۔ ''لمحات'' میں حمد کے علاوہ جو کچھ ہے، وہ ۱۹۳۵ء سے تقریباً ۱۹۵۵ء تک کا ہے، ''مہر وماہ'' کو لکھے ہوئے شاید بیس سال ہو گئے ہوں گے، تازہ ترین شے ''کرب آگہی ہے'' ہے جو میری زندگی کا نچوڑ ہے، میں نے جو کچھ، اس کے علاوہ لکھا ہے، اسے میں ترازو کے ایک پلے میں اور ''کرب آگہی'' کو دوسرے پلے میں رکھنے کو تیار ہوں۔ اس اعتماد کے ساتھ کہ دوسرا پلہ بھاری رہے گا اور یوں تو میں کیا اور میری تصانیف کیا.....

کتابت کے بعد، اسی طرح غزلیں بھی، ہاتھ سے جاتی رہیں۔ زندگی بخیر رہی تو ان کا تعاقب کر کے کتاب کے زندان میں اسیر کروں گا۔ ''مہر وماہ'' میں بعض اچھے خطوط غائب ہیں۔ طرہ یہ کہ ''لمحات'' میں وہ غزل ناپید ہے جس کے ایک شعر نے قبول عام حاصل کر لیا تھا، دو اور میرے اعتبار سے اچھی غزلیں گم ہوگئیں اور پندرہ بیس غزلیں اور بھی، اس سے میری بے ترتیبی کا اندازہ لگائیے۔

خیر اندیش

سید حامد

سید حامد صاحب کے ہی دو تین خط کا ذکر کر کے آگے بڑھوں گا کیونکہ ان میں ایسی

باتیں، ایسے احساسات تحریر ہوتے ہیں جو شاید کہیں اور نہ تحریر ہوتے ہوں۔ صفحہ ۱۵۹ پر شائع ۲۱ر دسمبر ۱۹۸۷ء کے خط میں لکھتے ہیں:

مجنوںؔ صاحب کی موت کو غزالوں سے پوچھئے کہ وہ ویرانے کو اداس کر گئے، ابھی دو ماہ ہوئے میری بیوی ان سے مل کر آئی تھیں اور ان کا پیغام میرے لئے لائی تھیں مجھے ان سے ملے ہوئے تقریباً دو سال ہو گئے تھے۔ شاید آپ سے ذکر نہ کیا ہو، ہماری شادی مجنوں صاحب نے ہی لگائی تھی۔ گورکھ پور کے قیام کے دوران ان سے اکثر ملاقات رہتی تھی۔ آن بان والے آدمی تھے۔ اللہ مغفرت فرمائے۔

آپ کی دوسری کتابیں تلاش کرنے کے باوجود نہیں مل پاتی ہیں۔ میں بے حد شرمندہ ہوں، گھر سے جانا تو نہیں چاہئیں۔ لیکن ان کی حفاظت نہ کرسکنا غیر ذمہ داری کا ثبوت ہے۔ ایک کتاب تو شاید پاکستان کی تھی، میں ان شاء اللہ اسے منگوانے کی کوشش کروں گا۔ دوسری کتاب شاید مقامی ہے، حاصل ہو جائے گی۔

والسلام

سید حامد

علی گڑھ ایسا مرکز علم و ادب ہے جس نے ایک صدی سے زیادہ مدت کے دوران متعدد نسلوں کی تربیت کی ہے لاکھوں کی ذہن سازی کی ہے۔ یہاں کے خوشہ چیں دنیا کے کسی بھی حصے میں ہوں علی گڑھ، مرکز علم و دانش کی خوشبو ان کے ایک ایک ریشے میں سمائی رہتی ہے۔

سید حامد صاحب بھی یہیں کے پروردہ بعدہ میر کارواں بھی رہے۔ اپنے احساسات ۲۰ر مئی ۱۹۸۹ء میں بیان فرماتے ہیں۔

''زمانے کے لیل و نہار دیکھئے جہاں پہلے ناقدری کی کھٹک تھی، اسی علی گڑھ میں اب اتنی قدر ہوتی ہے، اتنی محبت ملتی ہے کہ آنکھیں نم ناک ہوں تو اسے دل کا قصور ٹھہرائیے۔ میرے لئے تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ مجھے لگاؤ ہے۔ میری بیوی کو کیا کہئے گا کہ ایک زمانے میں وہاں کے مظالم سے بیزار رہنے کے بعد اب علی گڑھ جانے کے لئے بہانے ڈھونڈتی ہیں۔ ..... علی گڑھ نے اپنے بانی کے ساتھ جو روش اختیار کی ہے وہ افسوس ناک ہے اور عبرت انگیز ایک رسم رہ گئی۔ دل کے اجزا جن تقریروں اور تحریروں میں شامل نہ ہوں لفاظی نہ کہئے تو کیا کہئے۔

خیر اندیش

سید حامد

بات صرف سید حامد صاحب، پروفیسر سرور صاحب یا مشفق خواجہ صاحب کے خطوط کی نہیں ہے۔ اس مجموعۂ مکاتیب میں مشاہیر علم و ادب کے ایسے گراں قدر خطوط اور تاریخی اور تہذیبی افکار شامل ہیں جن کے مطالعے کی خواہش پیدا ہوتی ہے اور ہر بار کے مطالعہ کے بعد اردو دنیا کے نصف صدی کے تہذیبی، تعلیمی اور اشاعتی سرگرمیوں کا افق روشن ہوتا رہتا ہے۔ یہ تاریخ کی کوئی کتاب نہیں لیکن اس کی مدد سے علمی فکری تہذیبی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کی ایک تاریخ بہر حال مرتب کی جاسکتی ہے۔ برصغیر اور دنیا کے مختلف ملکوں میں پھیلے وہ حضرات جن کے مکاتیب اس مجموعہ میں شامل ہیں اور جن کے قریبی مراسم پروفیسر اصغر عباس صاحب سے رہے ہیں ان کی تعلیمی ادبی، شخصی اور اداراتی سرگرمیوں اور ان کے دائرہ کار کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔

اس مجموعۂ مکاتیب میں ایسے خطوط بھی ہیں جو کسی امر کی وضاحت سے متعلق بھی ہیں چونکہ اس میں صرف آنے والے خطوط شامل ہیں اس لئے مکتوب نگار کو مکتوب الیہ نے کیا جواب لکھا اس کا علم نہیں ہوسکتا لیکن ایک شخص کے متعدد خطوط کے بالترتیب مطالعہ سے یہ سمجھتے دیر نہیں لگتی کہ مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے مابین پر اعتماد اور قابل ستائش مراسم رہے ہیں، آج کی مصروف اور بڑی حد تک خود غرض زندگی میں دوسروں کے کام آنا، ان کے لئے دو سطریں لکھنا ماحول سے آنکھیں چار کرنے کا موقع ضرور فراہم کرے گا جب لوگ دوسروں کے کام آکر، علم و ادب کے فروغ کے لئے دو قدم چل کر خوشی محسوس کرتے تھے۔ اس زاویہ سے یہ کتاب ایک دستاویز نظر آنے لگتی ہے جس کے مطالعہ سے ڈیڑھ سو اشخاص کے کئی سو خطوط ہمارے ذہن و فکر میں وسعت اور گیرائی پیدا کرتے ہیں۔

اگر طوالت کا خوف نہ ہوتا تو میں متعدد حضرات کے درجنوں خطوط کا ذکر ضرور کرتا جنہوں نے برصغیر کی تعلیمی اور تصنیفی سرگرمیوں میں جہاں تہاں سے اپنی شرکت ضرور درج کرائی ہے اور ان کی تگ و دو کی منتشر ہی سہی، ایک روداد اس مجموعہ مکاتیب میں مل جاتی ہے۔ اس لئے چند نام گنانے اور ان کے خط کے بعض نکتوں کا ذکر کر کے بات پوری کرنے کی کوشش کروں گا کیونکہ اس کے بغیر زیر تجزیہ کتاب کے ساتھ انصاف نہیں ہوسکتا اور نہ ہی مرتب کتاب کی مساعی کا صدقِ دل سے اعتراف کیا جاسکتا ہے۔

قاری کے شوقِ مطالعہ کے پیش نظر اشارتاً

متعدد مشاہیر کے نام مع تعارف درج کر رہا ہوں مگر وضاحت کی ضرورت نہیں کہ سبھی خطوط میں کتابوں اور مضامین کا ذکر ہے تحقیقی اور تصنیفی مراحل کی گفتگو ہے۔ کچھ نجی معاملات بھی زیر گفتگو آ گئے ہیں۔ کتابوں کی اشاعت، کتابت اور ادبی تحائف کی باتیں ہیں۔ ادبی سمیناروں، مذاکروں یا جہاں تہاں مشاعروں اور ادبی محفلوں کے انعقاد کے تذکرے ہیں اس مجموعہ مکاتیب میں امتیاز علی خاں عرشی، ڈائرکٹر رضا لائبریری رام پور، بی شیخ علی سابق وائس چانسلر منگلور یونیورسٹی اور ''سالار'' بنگلور کے مدیر، بشیر بدر، جاوید اقبال، صاحب زادہ علامہ اقبال، جمیل جالبی، سابق وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی، حامدی کاشمیری، کشمیر یونیورسٹی، حسن ثانی نظامی متولی درگاہ حضرت نظام الدین، حکیم عبدالحمید بانی جامعہ ہمدرد دہلی، ڈاکٹر خلیق انجم سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند، رشید حسن خاں محقق، رشید الظفر سابق وائس چانسلر ہمدرد یونیورسٹی، سید حسن عباس، سابق ڈائرکٹر، رضا لائبریری رام پور سید محمد عقیل رضوی، الہ آباد یونیورسٹی، سید ہاشم علی سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، پروفیسر شارب ردولوی پروفیسر جے این یو، شان الحق حقی پاکستان، پروفیسر شکیل الرحمن سابق وائس چانسلر متھلا یونیورسٹی، صدیق جاوید پاکستان، پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی جے این یونئ دہلی، پروفیسر ظفر احمد صدیقی، عابد رضا بیدار سابق ڈائرکٹر خدا بخش لائبریری پٹنہ، پروفیسر عبادت بریلوی، قرۃ العین حیدر، پروفیسر قمر رئیس اور مشفق خواجہ پاکستان (جن کے تمام اٹھارہ خطوط میں تحقیقی کاموں اور کتابوں کا جی بھر کر ذکر ہوا ہے) اور دیگر مشاہیر کے خطوط میں بھی علمی، تصنیفی اور تحقیقی موضوعات پر گفتگو مرکوز رہی ہے۔ میں یہ لکھنے میں اطمینان کا احساس کر رہا ہوں کہ یہ کتاب ۲۰۲۰ء میں شائع ہونے والی اردو کی اہم کتابوں میں سے ایک ہے جس کا مطالعہ قاری کو دنیا جہان کی علمی ادبی شخصیات، ان کے باہمی تعلقات، اور سرگرمیوں سے روبرو ہونے کا موقع فراہم کرے گی۔

اخیر میں ان دو خطوط کو نقل کروں گا جو بالترتیب سابق صدر شعبہ لسانیات مسلم یونیورسٹی پروفیسر عبدالعظیم اور ماہنامہ ''آج کل'' اردو دہلی کے مدیر محبوب الرحمٰن فاروقی صاحبان کے ہیں ان دونوں خطوط کی اشاعت، پروفیسر اصغر عباس صاحب کی کشادہ قلبی اور اعلیٰ ظرفی کا مظہر ہیں۔ موصوف نے ان دو حضرات کو بھی ضیا بار افراد میں شامل کر کے اپنے ان بے تکلف دوستوں کو صدقِ دل سے نوازا ہے۔

نیو یارک سٹی
۱۲۱ر فروری ۱۹۹۸ء

محبی ڈاکٹر اصغر عباس تسلیم

آپ کی دوستی میں بھی ندرت کی شان ہے۔ جب ہم لوگ نیو یارک میں ہوتے ہیں تو آپ کو ہماری یاد آتی ہے۔ اور جب علی گڑھ پہنچ جاتے ہیں تو آپ کو ملنے تک کی فرصت نہیں ہوتی اور ٹیلی فون کا سلسلہ بھی ایک دو منٹ میں منقطع ہو جاتا ہے۔....

مخلص
عبدالعظیم

گورکھ پور میں آپ کے ہم سبق رہے بے تکلف دوست اور ''آج کل'' اردو نئی دہلی کے مدیر محبوب الرحمٰن فاروقی کا خط ملاحظہ ہو جس کے ساتھ مضمون کا اختتام ہو رہا ہے:

پبلی کیشنز ڈویژن
پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی
۷ر جون ۱۹۹۴ء

عزیز دوست

میرے تابڑ توڑ لکھے گئے سات خطوط کے جواب میں کل تمہارا اِن لینڈ ملا۔ جس میں تم نے ابھی دریافت کیا ہے کہ جذبی صاحب سے کئے گئے انٹرویو کو صاف کر کے بھیجوں یا نہیں، اب میں اس کو کیا کہوں، اپنا سر پیٹوں یا تمہارا چار ماہ سے جس سلسلے میں تم سے خط و کتابت ہو رہی تھی اس کے بارے میں وقتِ نزع تم پوچھ رہے ہو کہ پانی پلاؤں یا نہیں۔ دوست اب وقت نکل چکا، تمہیں یہ خط جب تک ملے گا جذبی نمبر پریس میں جا چکا ہو گا۔ اب تم اپنا انٹرویو صاف کر کے کسی اور رسالے کو بھیج دو۔

فقط والسلام
محبوب الرحمٰن فاروقی

پروفیسر اصغر عباس صاحب تمام اردو والوں کی طرف سے شکریئے کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اپنے نام آنے والے سینکڑوں خطوط کو برسہا برس سے محفوظ رکھا اور کرونا کی بیماری کے باعث لاک ڈاؤن میں خانہ قید ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ان خطوط کو انتخاب و ترتیب کے مراحل سے گزار کر شائع کرا دینے میں کامیابی حاصل کی۔ مقام شکر ہے کہ ایک علمی سرمایہ محفوظ ہو گیا جو ان شاءاللہ آئندہ نسلوں کے کام تو آئے گا ہی موجودہ دور کے قاری کے لئے بھی ماضی قریب کی ادبی اور علمی شخصیات کی مکتوب نگاری سے بھر پور استفادے کا موقع فراہم کرتا رہے گا۔

☆☆☆

دورِ جدید کے تقاضے اور ادب اطفال کی معنویت

چراغ ہبلوی
(ہبلی، کرناٹک، انڈیا)

کسی بھی زبان کا ادب صرف ادب ہی نہیں ہوتا ہے بلکہ اس زبان کے بولنے والوں کی زندگی کے تجربات واحساسات اور مستقبل کے حسین خوابوں کا آئینہ بھی ہوتا ہے۔ادب خوبصورت پیرایہ اظہار سے وجود پاتا ہے۔ادب کی زبان بڑی موثر اور مربوط ہوتی ہے۔اس کی زبان میں ہم آہنگی اور روانی ہوتی ہے۔طرز دلکش اور اسلوب دل پذیر ہوتا ہے۔یہی وہ دل پذیری ہے جو ہر کس و ناکس کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔خاص کر بچوں کو بہت جلد اپنے طرف مائل کر لیتا ہے۔اس کی توضیح اس طرح کی جاسکتی ہے کہ والدین کو بچوں سے جو محبت ہوتی ہے۔وہ ازلی ہے۔اسی لئے جب بھی کسی گھر میں بچہ پیدا ہوا ہوگا تو ماں نے اسے ضرور لوری سنائی ہوگی، کچھ قصے کہانیاں بتائی ہوں گی، اس طرح دیکھا جائے تو بچوں کے ادب کا آغاز دنیا کے آغاز سے جوڑا جاسکتا ہے۔یعنی بچوں کا ادب گہوارہ سے لیکر قبر تک رواں دواں رہتا ہے۔جو بچے ادب وتمیز سے کورے رہ جاتے ہیں وہ حقیقی معنوں میں زندگی کے صحیح لطف سے بیگانے رہ جاتے ہیں۔جس طرح بچوں کو تعلیم وتربیت کی ضرورت ہے بالکل اسی طرح ہماری تہذیبی قدروں اور ثقافت کی ترویج وبقا کا راز بچوں کے ادب میں پوشیدہ ہے۔جس زبان میں بچوں کے ادب پر جتنی زیادہ توجہ دی جائیگی اس زبان کا ادب اتنا ہی زیادہ مستحکم ہوگا۔کیونکہ بچوں کا ادب ایوان ادب کی تعمیر کرتا ہے اور اس کی بنیاد کا پہلا پتھر ہے۔اگر بنیاد کا پتھر سیدھا نہ رکھا جائے تو پھر پوری عمارت کا حسن غارت ہوجائیگا۔

ہم جانتے ہیں کہ بچہ آدمی بننے تک ماحول اور معاشرہ کا ایک خاص حصہ ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ آدمی ماحول سے آلودہ ہوجاتا ہے۔جبکہ بچہ صاف وشفاف رہتا ہے۔اسی لئے ادب اطفال کو زندگی کی صفائی، معصومیت اور تعمیری خوگر ہونا چاہیے۔ادب اطفال کا مقصدی پہلو پوری طرح نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔بچہ کو ایک دائراتی زندگی میں پروان چڑھانا چاہئے جہاں تعمیری ادب کا رجحان زیادہ ہو۔اسے غیر نامیاتی دائرہ کار کا ضرور خیال رکھنا چاہیے۔یعنی ایسی چیزوں کی اشاعت وتدوین سے گریز کرنا چاہئے جن میں بچوں کی حوصلہ شکنی ہو، ان کے افعال وکردار پر برا اثر پڑے، اخلاقی اقدار کے بگڑنے کا خوف پیدا ہو، یا جذبۂ انسانیت پر ضرب پڑے۔یہاں ایک بات یاد رکھنی چاہئے کہ بچے کے ذہن پر ایک بار جو چیز ثبت ہوجاتی ہے وہ زندگی بھر قائم رہتی ہے۔اس لئے ادب اطفال کو ادب کی فیشن پرستی سے آزاد ہونا چاہئے تاکہ وہ نئی نسل کی روحانی، ذہنی، جسمانی اور تعلیمی نشوونما میں مثبت کردار ادا کر سکے۔انہیں اس طرح کی چیزیں پڑھنے کے لئے دی جانی چاہئے جن میں اصلاحی پہلو زیادہ نمایاں ہو، اور جن سے ان کی قوت ارادی میں اضافہ ہو، نیز شر پر خیر کی جیت کا خاکہ ان کے ذہن میں پوری طرح واضح ہو۔اس لئے ادب اطفال کو بچوں کی خواہش، ان کی پسند، ان کی اختراعی صلاحیت اور ان کے تخیل کی پرواز کو مہمیز دینے والا ہونا چاہئے۔زبان وبیان کی سادگی وسلاست کے ساتھ ساتھ اظہار مطالب کی خوبیوں اور دلکشی پر بھی توجہ ہونی چاہئے۔نیز اس قسم کی کہانیاں، نظمیں، ڈرامے اور ناول لکھنا چاہئے جو بچوں کو اپنی ثقافت سے جڑے رہنے کے احساس کے ساتھ فعال بنائیں۔کچھ بچے ایسے بھی ہوتے ہیں جو ادب کے ساتھ باہری دنیا کا غیر مہذب ادب بھی اپنے ساتھ لے آتے ہیں یا دیکھ چکے ہوتے ہیں۔ایسے بچوں پر خاص نگرانی ونفسیاتی انداز سے توجہ دینے کی اشد ضرورت ہے۔جیسے آجکل موبائل کے خرافات جن میں بچہ بہت جلد جنسی وتخریبی رجحان کی طرف کافی تیزی سے آگے بڑھتا ہے۔ان بچوں کو تعمیری راہ پر گامزن کرنے کے لئے بڑے لاڈ پیار سے اور اچھے برے کا فرق بتلاتے ہوئے سمجھانا چاہئے۔ترش روی، ڈانٹ ڈپٹ سے گریز کرنا چاہئے کہ بچہ باغی نہ ہوجائے۔

یادرہنا چاہئے کہ دراصل بچے ہی کائنات اور مستقبل کے معمار ہوتے ہیں۔کل دنیا کی باگ دوڑ انہیں کے ہاتھوں میں ہوگی،اس لئے انہیں اس قسم کا ادب پڑھنے کو ملنا جو ان کے حوصلوں کو بلند رکھے،ان میں جوش وامنگ پیدا کرے، نیز خیر وشر کی خوبی وخرابی سے آگاہی کرے،تاکہ آئندہ زندگی کی تعمیر میں تخریب کاری کی نموکاری نہ ہوسکے۔ جہاں تک ممکن ہو زندگی کی مثبت قدروں کی بحالی ہی ادب اطفال کا مقصد ہو۔اس لئے بچون کے ادیبوں کو چاہئے کہ وہ ان بچوں کے لئے ایسی چیزیں تخلیق کریں جو حقیقت سے قریب ہو،عوامی اور سماجی زندگی کا رس لئے ہوئے قصے کہانیاں، جو زندگی کی اچھی، سچی اور حقیقی قدروں کو پیش کرتی ہیں۔لیکن ایک بات کا خاص خیال رکھنا بے حد ضروری ہے۔وہ یہ کہ بچوں کے لئے جو کچھ بھی لکھا جائے وہ کہانی کے انداز میں لکھا جائے۔وہ تفریح طبع کے انداز میں لکھا جائے،یعنی مقصد بنا کر نہ لکھا جائے،بچوں کو یہ محسوس نہ ہونے پائے کہ انہیں نصیحت کی جا رہی ہے۔یا یہ کہ انہیں کچھ پڑھانے کی کوشش کی جارہی ہے۔کیونکہ جیسے ہی انہیں یہ محسوس ہوگا کہ انہیں نصیحت پلائی جارہی ہے وہ وہاں سے بھاگ کھڑے ہونگے۔ادیبوں کے لئے بچوں کی عمر اور نفسیات کا بھی خاص خیال رکھنا ضروری ہے۔کس عمر کے بچے کو کیا بات ہضم ہوتی ہے۔وہ کہاں تک اس کہانی،قصہ کو سمجھ پاتا ہے،اور اس سے کیا نتیجہ اخذ کرتا ہے۔کیونکہ بچے کی بڑھتی عمر کے ساتھ ساتھ اسکی دماغی صلاحیتیں بھی پروان چڑھتی ہیں۔جو کہانی قصہ آپ پانچ سال کے بچے کو سناتے ہیں وہ دس بارہ سال کے بچے کو ناگوار گذرتی ہے،وہ بور ہونے لگتے ہیں۔اسی طرح جوان بچے انکا مزاج وذہن الگ ہوتا ہے۔من جملہ بچوں کی عمر کے مطابق ادب اطفال کی تخلیق ہونی چاہئے۔لہٰذا ضروری ہے کہ بچوں کے لئے جو کتابیں لکھی جائیں ان میں بچوں کی اعلی اخلاقی تعلیم ،ان کے نفس ذات کی تربیت،ان کے عقائد صالح کی پختگی اور انکے تخیل پرواز کا بھرپور خیال رکھا جائے۔کیونکہ کتابیں اپنے مواد کی صفائی اور افادیت کے اعتبار سے جتنی مفید ہوتی ہیں۔اپنے مواد کی خرابی کی وجہ سے اتنی ہی نقصان دہ بھی ہوسکتی ہیں۔یہاں پر افلاطون کا قول نقل کرنا بہت ہی مناسب معلوم ہوتا ہے:’’گھر کی عورتوں کو اچھی اچھی کہانیاں یاد کرائی جائیں جو وہ اپنے بچوں کو سناسکیں۔بچوں کو ہرگز ایسی کہانیاں نہ سنائی جائیں جو اُن میں غیر اخلاقی باتوں کو جنم دیں۔‘‘

بالکل یہی باتیں ادب اطفال سے متعلق تصنیف وتالیف کا کام انجام دینے والے فنکاروں کے لئے کہی جاسکتی ہیں۔یعنی وہ اپنی نظم ونثر میں ایسی چیزوں کو جگہ دیں جو بچوں کو حوصلہ مند بااخلاق،مخلص اور باکردار انسان بنا سکے۔ ایسی چیزوں کو از راہ تفریح بھی ادب اطفال میں شامل نہیں کرنا چاہئے جن سے بچوں میں کسی قسم کی برائی پیدا ہو۔بچے کی زبان و لہجے کا بھی خاص خیال رکھنا ضروری ہے۔جتنا آسان وشائستہ لہجہ ہوگا بچہ اسی قدر متاثر ہوگا۔بچے کی عمر کی پسند کے مطابق،انکی جبلت کو ملحوظ رکھنا چاہئے۔جہاں بچے کی نفسیات کا خیال رکھنا ضروری ہے وہاں بچے کے ماحول پر بھی نظر رکھنا ضروری ہے۔

دور جدید میں جہاں’’ٹی،وی،اور موبائل کی بھرمار ہے۔بچوں کو ایسے پروگراموں سے دور رکھنا بھی ضروری ہے جس میں بھونڈا مذاق،عشق ومعاشقے،اور ڈراؤنی چیزیں ہوتی ہیں۔ہاں ایسے پروگرام جس میں بچوں کو ایک سبق ملتا ہو یا کچھ نئی نئی باتیں سیکھنے کا موقع ملتا ہو،اسے دکھانے میں کچھ مزائقہ نہیں۔یہ اسلئے کہ آج کے دور کا بچہ کوئی بھی ایسا نہیں ہوگا جو ٹی وی،موبائل سے دور ہوگا۔لہٰذا ادب اطفال کے ادیبوں پر بڑی ذمہ داری بھی بڑھ جاتی ہے کہ وہ اس ماحول میں بچوں کے لئے اپنی طرف مائل کرنے والا ادب پیش کریں۔

ادیب اپنے وقت کا حساس ترین انسان ہوتا ہے۔وہ کسی بھی چیز کو کسی بھی واقعہ اور معاملہ کو عام آدمی کی بہ نسبت زیادہ شدت سے محسوس کرتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ایک اچھا ادیب بہ یک وقت ماضی،حال، اور مستقبل پر نظر رکھتا ہے۔ وہ جہاں ماضی سے روشناس ہوتا ہے، وہیں حال کا صورت آشنا اور مستقبل کا نباض بھی ہوتا ہے۔اس کے تجربات اور مشاہدات بڑے واضح ہوتے ہیں۔وہ اپنے تجربات ومشاہدات کو کسی بھی دل پذیر سانچے میں ڈھال کر پیش کر سکتا ہے۔دردمندی اور انسان دوستی اس کے مزاج کا خاص وصف ہے۔متعصب اور تنگ نظر انسان بہت اچھا ادیب نہیں ہوسکتا۔اسی لئے پہلے خود ایک صالح اچھا ادیب بن کر دنیا کے سامنے آئے پھر اسکی ہر تخلیق قابل قبول ہوگی۔زمانہ بڑی تیزی سے تخریب کاری کی طرف مائل ہورہا ہے۔ضرورت ہے کہ ہم اپنے نو نہالوں کی تربیت وصالح ادب کی تخلیق میں کسی طرح کی کوئی کمی نہ کریں۔ورنہ وقت کبھی ہمیں معاف نہیں کرے گا۔

☆☆☆

'نیتی آیوگ' اور سماج کے استحکام میں اس کا کردار

ڈاکٹر عذرا بانو

(ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ معاشیات، ناری شکچھا نکیتن، لکھنؤ)

آزادی کے فوراً بعد یعنی ۱۹۵۰ میں ہندوستان میں سرکاری سطح پر 'یوجنا آیوگ' کا قیام عمل میں آیا۔ آزادی سے قبل تین 'یوجنا آیوگ' ملک کے معروف سرمایہ داروں کے ذریعے بنائے گئے تھے جن میں سب سے پہلا ''بامبے پلان'' تھا۔ جس کا خاص مقصد تھا معیشت کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنا۔ 'بامبے پلان' جن 8 خاص صنعت کاروں نے مل کر بنایا تھا ان کے نام ہیں: جے آر ڈی ٹاٹا، گھنشیام داس برلا، اردیشر دلال، لالہ شری رام، کستور بھائی لال بھائی، پروشتم داس ٹھاکرداس، اے ڈی شراف، ڈاکٹر جان متھائی۔ 'بامبے پلان' کی تشکیل پندرہ سال کے لئے کی گئی تھی۔ مگر افسوس یہ اپنے مشن میں کامیاب نہ ہوسکا۔ اس کے بعد پیپلز پلان (Peoples Plan) سامنے آیا جس کو بنانے کا سہرا ایم۔ این۔ رائے کو جاتا ہے جو انڈین فیڈریشن آف لیبر کے سربراہ تھے۔ یہ 'بامبے پلان' سے پوری طرح الگ تھا۔ اس کا خاص مقصد لوگوں کو کھانا، کپڑا، گھر، دوائی اور تعلیم فراہم کرنا تھا۔ اس میں زراعت کی ترقی کو سرِفہرست رکھا گیا تھا کیونکہ ملک کی کل آبادی کا پچاس فیصدی سے زائد حصہ یہاں برسرِ روزگار تھا۔ صنعتوں میں عام لوگوں کی ضروریاتِ زندگی کی اشیاء کو مہیا کرانے کا کام جاری رکھا۔ لیکن یہ پلان بھی کامیاب نہ ہوسکا۔ اور آخر میں گاندھین پلان (Gandhian Plan) کی تشکیل ہوئی جو گاندھی جی کے خیالات پر مبنی تھا۔ جسے شریمن نارائن نے وضع کیا تھا۔

کل ملا کر یہ تینوں پلان معیشت کی ترقی کے لئے مؤثر ثابت نہ ہوسکے۔ آخر کار آزادی کے بعد ۱۹۵۰ میں 'یوجنا آیوگ' کا قیام پنڈت نہرو کی سربراہی میں عمل میں آیا، جو ۲۰۱۵ تک اپنی کارکردگیوں کے ذریعے ملک کی فلاح کے لئے بامقصد طریقہ کار سے معیشت کو بہت آگے لے جانے میں کامیاب ہوا۔ ابھی 13 واں پنج سالہ منصوبہ چل ہی رہا تھا کہ 2015 میں وزیر اعظم نریندر مودی نے 'نیتی آیوگ' کی تشکیل کی۔ 'نیتی آیوگ' ارجنوری 2015 کو مرکزی کابینہ کے ایک عہدنامے کے ذریعہ وجود میں آیا۔ 'نیتی آیوگ' بھارت سرکار کی ایک اہم پالیسی ساز ''تھینک ٹینک'' (Think Tank) کی طرح کام کرتا ہے۔ جو معیشت کو آگے بڑھنے کا راستہ دکھاتا ہے۔ نیتی آیوگ بھارت سرکار کے لئے کارکردگیاں وضع کرتا ہے اور طویل المیعاد پالیسی اور پروگرام بناتا ہے اور ساتھ ساتھ مرکز و ریاستوں کو تکنیکی طور پر آگے بڑھنے کی صلاحیت بھی فراہم کرتا ہے۔ 'نیتی آیوگ' کے چیئرمین وزیر اعظم ہوتے ہیں اور ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ سمیت مرکز کے زیر انتظام علاقوں کے لفٹیننٹ گورنر اس کے گورننگ بورڈ میں بطور کل وقتی رکن شامل ہوتے ہیں۔ موجودہ دور میں معاشی کمیشن کا کام بھی نیتی آیوگ ہی کرتا ہے۔ معاشی کمیشن کا مقصد بھی عوام کو بہتر زندگی بسر کرنے کا موقع فراہم کرنا تھا۔ 'نیتی آیوگ' بھارت سرکار کا ایک ایسا منچ ہے جہاں سے معیشت کا خاص خیال رکھا جاتا ہے تاکہ ریاستیں معیشت کے استحکام کے لئے اپنی کارکردگیوں کو اچھے سے اچھا بنا سکیں اور بہتر پروگرام کے ذریعہ ایک ساتھ مل کر معیشت کو ترقی کے راستے پر لا سکیں جہاں سے ملک کی ایک خاص پہچان بنے اور ملک ترقی یافتہ ممالک و مستحکم معیشتوں کے مقابلے میں آگے نکل سکے۔

وزیر اعظم نریندر مودی نے ۷/ جون 2018 کو عہدیداروں اور خصوصی مندوبین کو شامل کرنے کے لئے نیتی آیوگ کی ازسرِ نو تشکیل کی منظوری دی ۔ نائب صدر ڈاکٹر راجیو کمار بنائے گئے اور ہمہ وقتی ممبران کے طور پر شری وی کے سارسوت ، پروفیسر رمیش چندر اور ڈاکٹر وی کے پال نامزد کئے گیے ۔ ان عہدیداروں میں شری ٹتن گڈکری ،شری تھاور چند گہلوت ،شری پیوش گوئل اور شری راؤ آنند جیت سنگھ کو شامل گیا۔ نیتی آیوگ کے مقاصد کو کچھ اس طرح بیان کیا گیا ہے:

(۱) سبھی ریاستیں اپنا کام اچھی طرح کریں اور معیشت کو جن اشیاء کی بے حد ضرورت ہے ان کو سرِ فہرست رکھیں۔

(۲) مضبوط ریاست ہی مضبوط معیشت کی تکمیل کرتی ہے اس لئے معیشت کا بنیادی ڈھانچہ مضبوط بنانے میں اپنا پورا تعاون کریں۔

(۳) دیہی علاقوں کیلئے پروگرام سازی تا کہ وہاں بھی شہر جیسی ساری سہولیات مل سکیں۔

(۴) جو علاقے آیوگ کے ذمے کئے گئے ہیں ان کے سماجی تحفظ کے لئے احتیاطی قدم اُٹھائے جائیں۔

(۵) معیشت کے ان لوگوں کا خاص دھیان رکھنا جو سرکاری اسکیموں اور پروگراموں سے محروم رہ جاتے ہیں ان کو ہر طرح کی سہولت سے سرفراز کرنا۔

(۶) اسٹریٹیجک اور طبی مدد کے لئے پروگرام بنانا اور بیچ بیچ میں ان کی دیکھ بھال کرتے رہنا کہ وہ ٹھیک طرح سے اپنے کام کر رہے ہیں یا نہیں اور اگر ان کو کسی تکنیکی مدد کی ضرورت ہو تو آسانی کے ساتھ فراہم کرنا۔

(۷) قومی و بین الاقوامی سطح پر تھنک ٹینک اور ساتھ ہی ساتھ تعلیم اور ریسرچ کا دھیان رکھنا اور ان کے ساتھ پورے طور سے تعاون کرنا۔

(۸) قومی اور بین الاقوامی عہدیداروں اور معزز لوگوں کے رابطے میں رہنا اور وقت کے ساتھ ساتھ ان لوگوں سے مل کر نئی صنعتوں کے قیام میں بھرپور تعاون کرنا اور ایک اور اعلیٰ سطحی منچ تیار کرنا۔

(۹) ریسرچ کی دنیا میں ہر طرح کے لوگوں سے ملنا اور آسانیاں فراہم کرنا تا کہ ملک کی معیشت سائنس وٹکنالوجی کے معاملہ میں کسی سے پیچھے نہ رہے۔

(۱۰) ملک کی ترقی کے لئے ایجنڈہ بنانا اور اوپر دیئے گئے جتنے بھی مقاصد ہیں ان کو پوری طرح سے حاصل کرنے کی کوشش کرنا اور جو قدرتی وسائل ہیں ان کا بھرپور استعمال کرنا۔

نیتی آیوگ آج ایک تکنیکی سنٹر کے روپ میں سامنے آرہا ہے جس میں ضروری وسائل مہیا کئے گئے ہیں جس کے ذریعہ افراد کو تعلیم یافتہ اور ہنر مند بنانے کے طریقے سوچے جارہے ہیں جو مستقبل میں ملک کو آگے لے جانے کا کام کریگا، ریسرچ اور نئے خیالات کو بڑھاوا دے گا۔ نیتی آیوگ کی پوری کارکردگیوں کو ذیل کے اہم حصوں میں بانٹا جاسکتا ہے:

(۱) پالیسی سازی اور منصوبہ بندی کے بنیادی خدوخال واضح کرنا۔

(۲) باہمی عوامی شراکت کو بڑھاوا دینا۔

(۳) تھنک ٹینک اور ریسرچ کو بڑھاوا دینا۔

نیتی آیوگ کے مختلف النوع ورٹیکلز کچھ یوں ہیں:

(۱) سبھی کی صحت، خاص کر عورتوں و بچوں کی صحیح نشو ونما پر دھیان دینا۔

(۲) ہنر کو بڑھاوا دینا اور روزگار فراہم کرنا۔ دیہی علاقوں میں بہتر زندگی کی سہولتیں مہیا کرانا۔ برابر اور لگاتار ترقی کے کام کرتے رہنا، ایز جی سیکٹر کی افزونی کا انتظام کرنا، شہروں کا نظام بہتر کرنا۔ صنعت اور قدرتی وسائل کا بھرپور استعمال کرنا، سائنس اور تکنیک اور سماجی فیصلوں کے ذریعہ عوام کو بااختیار بنانا، زمین اور پانی کے وسائل سے متعلق منصوبوں کو جانچنا پرکھنا، وغیرہ۔ نیتی آیوگ کو DEMO-DGQI اور NIC پر منصوبوں کی نگرانی کے لئے انفارمیشن ٹکنالوجی پر مبنی سسٹم کے استعمال کی جانچ پرکھ کرنے کی ذمہ داری دی گئی ہے جو مختلف محکموں اور وزارتوں کے ڈاٹا تیاری کی جانچ کرنے کا کام کرے گی اور اس کے لئے جو نقشہ اسے بتایا گیا ہے جیسے ڈاٹا بنانا، ڈاٹا کی تقسیم، ڈاٹا کا تجزیہ اور اس کا استعمال نیز دور دور تک پھیلانا، تکنیک کے استعمال کے ذریعہ ڈاٹا محفوظ کرنا اور H . R صلاحیت کے حصول کے ساتھ ساتھ کیس اسٹڈی پر مبنی ۶۵ محکموں اور وزارتوں کے ذریعہ خود جانچ پرکھ کیلئے ایک ڈاٹا بنانا اس کی ذمہ داری میں شامل ہے۔

آخر میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ 'یوجنا آیوگ' اور 'نیتی آیوگ' میں بہت سی کارکردگیاں یکساں ہیں تو کچھ الگ بھی ہیں۔ جس طریقے سے 'یوجنا آیوگ' نے ملک اور سماج کی ترقی اور استحکام میں اپنا کردار ادا کیا تھا اسی طریقے سے 'نیتی آیوگ' بھی اپنا کردار ادا کر رہا ہے بلکہ کچھ اس سے بہتر ہی۔ ☆☆

گناہ کا خوف

چودھری محمد علی ردولوی کا شمار ہمارے ادب کے صاحبِ طرز انشاء پردازوں میں ہوتا ہے۔ وہ ۱۵ر مئی ۱۸۸۲ کو ضلع فیض آباد کے مردم خیز قصبہ ''**ردولی**'' میں پیدا ہوئے اور ۱۰ر ستمبر ۱۹۵۹ کو اس جہانِ آب وگل کو خیر باد کہا۔ آپ **ردولی** کے 'عیدی میراں قبرستان' میں آسودۂ خاک ہیں۔ مئی کے مہینے میں آپ کی پیدائش کو ۱۴۰ سال پورے ہورہے ہیں، اس مناسبت سے سہ ماہی ادبی نشیمن کے قارئین کے لئے ان کا شاہکار افسانہ 'گناہ کا خوف' قندِ مکرر کے طور پر پیش کیا جارہا ہے تاکہ اردو کی کلاسیکی ادبیات سے رشتہ کمزور نہ ہونے پائے۔ یہ افسانہ چودھری صاحب کے افسانوی مجموعے 'گناہ کا خوف' سے ماخوذ ہے۔ (مدیر)

عبدالمغنی صاحب نے مختاری کے پیشے میں وہ نام پیدا کیا تھا کہ ڈپلوماوالے وکیل، بیرسٹر کیا کریں گے۔ بڑے بڑے زمیندار، تعلقدار، مہاجن خوشامد کرتے تھے، کمشنری بھر میں کون ابتدائی مقدمہ ایسا ہوتا تھا جس میں عبدالغنی صاحب دوفریق میں سے ایک کے مددگار نہ ہوں۔ ان کی ترتیب دی ہوئی مِسل دیکھ کر چوٹی کے وکلاء دنگ رہ جاتے تھے۔ اکثر کو یہ کہتے سنا ہے کہ اگر اس شخص نے وکالت کا امتحان پاس کرلیا ہوتا تو یہ ہائی کورٹ کے بہترین ایڈوکیٹس میں سے ہوتا۔

عبدالمغنی صاحب نے بلا کا دماغ پایا تھا، پَر نہیں کٹے تھے۔ صوبہ بھر میں کہیں کا مقدمہ ہو اور کیسے ہی پیچیدہ معاملات ہوں، اگر فریق مقدمہ ان تک پہونچ گیا تو سب مشکلیں حل ہوگئیں۔ زبان میں نہ معلوم کیا جادو تھا اور نہ معلوم کیسے انچھر یاد تھے کہ رام کرلینا کوئی بات ہی نہیں تھی۔ جہاں صلح کا موقع ہوا دوسرے فریق کے دل میں جگہ کرکے صلح کرادی۔ جہاں لڑائی کا موقع ہوا مخالف فریق کے بہترین آدمی توڑ لیے، کوئی دوسرا ہزار دو ہزار میں کام نکالے یہ سودوسو میں کامیاب ہوجائیں۔

وکیل نہ ہونے کا خود ان کو کبھی افسوس کرتے نہیں سنا اور افسوس کرنے کا موقع ہی کہاں تھا۔ کام اتنا تھا کہ فضول خیالی گھوڑے دوڑانے کا موقع بھی نہیں ملتا تھا۔ وکیلوں کے یہاں ایک محرر ہوتا ہے، کوئی ایسا ہی بڑا ہوا جس کے یہاں دو ہوئے۔ ہائی کورٹ کے اونچے وکلاء کے ساتھ دو تین جونیئر لگے رہتے ہیں۔ ان کے یہاں بیس آدمی کام کرنے والے تھے اور پھر نہ جونیئر کا سوال نہ سینئر کا۔ خالی ہر شخص کی فطری قابلیت دیکھ کر کام سپرد کیا جاتا تھا جو اپنا کام سمجھ کر کرتا تھا ان کے جلسے میں مقدمہ کے ہر پہلو سے اسپیشلسٹ موجود تھے۔ حسبِ حیثیت باموقع اعتبار والے دیدار وچشم دید گواہ مہیا ہوسکتے تھے۔ ان کے جلسے میں ایسے لوگ بھی موجود تھے جو سو پچاس برس کا سادہ، کرم خوردہ کاغذ نکال دیں۔ دھواں دے کر نئے کاغذ کو پرانا بنادیں، تین دن کے اندر حاشیہ کو دیمک سے چٹوادیں، متن ویسے کا ویسا ہی رہے۔

دستاویزوں میں سے الفاظ غائب کردیں اور عبارتیں اس طرح داخل کردیں کہ بڑے سے بڑا تحریرشناس دھوکا کھا جائے۔ ان کے ملنے والوں

میں ایک منشی صاحب تھے جو بائیں ہاتھ سے اور پاؤں سے بھی لکھ لیتے تھے اور شانِ خط بدل دیتے تھے۔ ہفت قلم تھے۔ اس معنی میں نہیں کہ نسخ، نستعلیق، شکست وغیرہ وغیرہ لکھ لیتے تھے بلکہ اس رو سے کہ مختلف لوگوں کے اندازِ خط کی ایسی نقل اتارتے تھے کہ خود لکھنے والا اگر کچھ دن بعد دیکھے تو نہ جانے۔

ان کے علاوہ ایسے لوگ بھی تھے جو اکثر ضرورت ہو تو مِسل گُھما دیں، ریل پر سے، کچہری کے احاطے سے، گھر سے یا جہاں سے بہترین موقع ہو، بستے سے ضروری کاغذ غائب ہو جائے، باقی ویسے ہی رکھے ہیں۔ بالکل اسی طرح کا بستہ رکھ دیا گیا اور گواہ گھر سے کاجل کا چورا صلی بستہ لے گیا۔ اپنے یہاں کے اُٹھنے بیٹھنے والوں میں سے ایک شخص کی خود تعریف کرتے تھے کہ انھوں نے وہ جرأت کی اور صفائی کا وہ کمال دکھایا کہ دوسرا ہوتا تو پاؤں کانپ جاتے اور دھر لیا جاتا۔ ایک بہت بوڑھے فریق مخالف عبا قبا پہنے، جاڑوں کے دن، بغل میں بستہ دبائے اپنے وکیل کے پیچھے کھڑے بحث سن رہے تھے۔ ان کی بغل سے بستہ نکل گیا اور کسی کو خبر تک نہ ہوئی۔ اس کے علاوہ ایسے لوگ بھی لگے رہتے تھے، جو لڑائی بھڑائی میں بھی بند نہ تھے مگر یہ سب دوسروں کے لئے کرتے تھے کیونکہ ان کے خیال میں مقدمہ بازی میں اور عشق بازی میں سب کچھ جائز تھا۔ مگر خود اپنے لئے عبدالمغنی صاحب ان تمام باتوں سے علاحدہ رہتے تھے۔ مقدمات معاملات کی اور بات ہے۔ مثلاً بیان ہوتا ہے ایک مرتبہ ایک نوجوان زمیندار تھا جو بالغ ہونے کے بعد اپنے بڑے بھائی پر مقدمہ چلانے والا تھا۔ سب سامان سے لیس تھا صرف دعویٰ داخل کرنا تھا۔ اسٹامپ خرید لیا گیا تھا۔ میعاد میں صرف تین دن باقی تھے اگر وہ دعویٰ ہو جاتا تو بڑے بھائی کا دیوالہ نکل جاتا اور یہ بھی زیربار ہو جاتا۔ بڑا بھائی ان کے پاس آیا عبدالغنی نے شکار کے بہانے سے اس لونڈے کو پھانسا اور تین دن کے بجائے چار دن کے لئے اس کو نہ جانے کہاں الوپ کر دیا کسی کو خبر تک نہ لگی۔ میعاد نکل جانے کے بعد چھوڑ دیا اور کچھ ایسی چالیں چلے کہ لونڈا حبسِ بیجا کا دعویٰ کرنا کیسا ان واقعات کے ذکر کرتے ڈرتا تھا۔ یوں بلاوجہ کسی کارویاں بھی کبھی نہیں ستایا، نہ اپنے ذاتی معاملات میں ان کو کسی کے ساتھ زیادتی کرتے دیکھا گیا۔ محلّہ میں ہر شخص سے یگانگی کا برتاؤ تھا اور کون ایسا تھا جس کی خدمت انھوں نے نہ کی ہو، اپنی بات کے دھنی تھے اور ارادے کے ایسے مضبوط تھے کہ جس بات پر قائم ہو گئے پھر اس سے نہیں ہٹتے تھے چاہے کچھ ہو جائے۔

ایک مرتبہ طاعون آیا۔ بیماروں کی خبر گیری غریبوں کی تیمار داری، میّتوں کا دفن کروانا، سب اپنے ذمے لے لیا۔ طاعون کے نام سے لوگ گھبراتے ہیں مگر یہ ہر جگہ پل پڑتے تھے، نہ معلوم کتنے مُردے خود اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتارے، لوگوں نے کہا انجکشن لے لو مگر انھوں نے پرواہ بھی نہ کی۔ ان کے مرشد نے ایک تعویذ بھیجا تھا وہ تو ضرور کُرتے کے نیچے گلے میں ڈال لیا تھا اور سورہ تغابن کی مزاولت رکھتے تھے اور بس، طاعون کی بلا ختم ہونے کے بعد عبدالغنی کا اثر اردگرد اچھا خاصا بڑھ گیا تھا۔ اول تو ایسے آڑے وقت میں لوگوں کے کام آئے تھے۔ دوسرے رفتہ رفتہ کچھ جائداد بھی پیدا کر لی تھی، بہت سی دکانیں بنوالی تھیں، جن میں کرایہ دار بساتے وقت کرایہ کا خیال اس قدر نہیں کیا جاتا تھا جتنا اثر بڑھانے کا اور لوگوں کو اپنی پارٹی میں شامل کرنے کا، چنانچہ میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈ وغیرہ کے الیکشن میں ان کا کینڈیڈیٹ اور ان کی پارٹی ہمیشہ جیتتی تھی انھیں وجوہ سے اگر مختار صاحب کسی سے کوئی بات کہہ دیں تو اس کو ٹالنا مشکل ہو۔ چنانچہ ان کے مکان کے قریب ایک زمین تھی جو ایک شخص نے مول لی تھی۔ عبدالمغنی اس کے خواہشمند تھے۔ یہ آراضی ان کے بھی موقع کی تھی اور اس کے بھی، مگر ان کے رعب کی وجہ سے وہ انکار نہ کر سکا۔ اسی زمین پر انھوں نے ایک مختصر سا مکان بنوایا تھا جو ابھی ابھی تیار ہوا تھا اور خیال تھا کہ مہمانوں نے کے لئے وقف رہے گا۔ نماز، روزے کے بڑے پابند

تھے مگر اسی کے ساتھ ہی زاہد خشک نہ تھے ۔ دوست احباب کے ساتھ چوک بھی چلے جاتے تھے۔خود ان کے گھر پر بھی اس طرح کی صحبتیں آراستہ ہوجاتی تھیں۔ان کے کمرہ کے کونے میں بایاں اور تان پورہ بھی رکھا رہتا تھا مگر یہ سب دوسروں کی خاطر اور آشنا پرستی میں گوارہ کرتے تھے۔خود ہمیشہ بے لوث رہتے تھے ،حسن پرستی تک کو جائز جانتے تھے مگر تر دامنی میں کبھی مبتلا نہیں ہوئے تھے ۔ وضع داری کا یہ حال تھا کہ ریاست پور میں کسی زمانہ میں مختار تھے اس سلسلے کو منقطع ہوئے برسوں گزر گئے تھے لیکن ان کے نام کا مختار نامہ آج تک پڑا تھا ،رئیس صاحب کی جائداد چوتھائی نہیں رہ گئی تھی ، کچھ اس وجہ سے اور کچھ اس وجہ سے کہ ان کی مصروفیتیں بہت بڑھ گئی تھیں ، انھوں نے رئیس صاحب کو مشورہ دیا کہ مختار نامہ صاحبزادے کے نام ہوجائے ۔ یہ سب کچھ تھا مگر آج تک رئیس کو اپنا آقا ہی سمجھتے تھے اور جو کام ہوتا تھا اپنا سمجھ کر کرتے تھے۔رئیس صاحب کے بیٹے اور یہ قریب قریب ہم سن تھے جس وقت کا یہ واقعہ بیان کرتا ہوں ، عبدالمغنی صاحب چالیس اکتالیس برس کے رہے ہوں گے اور شہامت علی رئیس صاحب کے بیٹے کا سن 35 برس کے قریب رہا ہوگا۔ آدمی ذرا شوقین مزاج تھے ،مقدمات کی پیروی میں بہت آیا کرتے تھے۔ ؎

فکر بازاری بھی ہر وقت ہے درباری بھی
اک مصیبت ہے جوانی بھی زمینداری بھی

اور چونکہ عبدالمغنی صاحب کی وجہ سے کھانے اور قیام کی جگہ سے بے فکر تھے ،اسلئے شوق بھی آزادی سے پورا ہوتا تھا۔ عبدالمغنی صاحب کے گھر میں ان کا کمرہ علاحدہ تھا جو سڑک کی طرف کھلتا تھا۔اس لئے اگر رات کو انھوں نے کسی کو بلایا بھی تو کسی کو خبر نہ ہوتی تھی۔ عبدالمغنی صاحب سے کوئی تکلف نہ تھا،خود ان کا دل چاہا یا شہامت علی کی خاطر سے منٹ دو منٹ کو چلے بھی آئے اور یہ دیکھ کر کہ خاص دان میں پان اور لوٹا گلاس پانی کا گھڑا سب موجود ہے، چلے گئے۔

شہامت علی صاحب جب مقدمہ کے سلسلہ میں آتے تھے تو عموماً دو تین دن رہتے تھے اور جب شہر کے قیام کا کوئی عذر معقول نہ رہ جاتا تھا تو چلے جاتے تھے ۔ ایک مرتبہ خلافِ عادت کئی دن رہے ۔ چہرے کی کچھ پریشانی کچھ فکرمندی سے عبدالمغنی کو پتہ چلا پوچھنے لگے خیر تو ہے۔

شہامت علی: یار کیا کہیں یہ سامنے درزی کی دکان نہیں ہے ،اس کوٹھے پر ایک رنڈی آئی ہوئی ہے کہیں باہر کی ہے، میں نے اب کی ہی دَورے میں دیکھا ہے ، بھئی ہم تو کھیت رہے مگر وہ ظالم کسی طرح رنگ پر آتی ہی نہیں۔ کچھ ہم نے بھی حماقت کی کہ اپنے دل کا راز اس پر ظاہر کردیا۔اس کے بعد اب تو اس کے مزاج ہی نہیں ملتے۔ گھُمن خان کو درمیان میں ڈالا مگر وہ پابندی کا عذر کرتی ہے اور یہاں یہ حال ہے کہ خواب وخور حرام ہے ۔ رات کی نیندیں اُڑ گئی ہیں اور جو جو ہم کوشش کرتے ہیں وہ اور کھنچتی جاتی ہے۔

عبدالمغنی: ان اونچی رنڈیوں میں یہی تو خرابی ہوتی ہے کہ یوں خاطر مدارات لگاوٹ سب کچھ کریں گی مگر معاملے کی بات پر عجیب مزاج کی لینے لگتی ہیں اور اگر کہیں جھوٹ موٹ کی نتھ پہنے ہوئیں تو آشنائی نہ ہوئی قلعہ ہی فتح کرنا سمجھئے ۔ چھوٹتے ہی بی نائکہ صاحب کہتی ہیں: ناصاحب !ابھی میری بچی کم سن ہے کچھ دن آیئے جایئے ،اٹھئے بیٹھئے ،لڑکی سے مانوس ہوجایئے،آپ اس کی طبیعت پہچان لیں وہ آپ کے مزاج سے واقف ہوجائے پھر لونڈی کو عذر ہی کیا ہوسکتا ہے۔

اگر پیشے میں آچکی ہے تو نوکری کا سوال پہلے ہی دھرا ہے۔مستقل تعلق کیجئے ، پابند کیجئے اور خود بھی پابند ہوجیے ،پھر سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ ادھر تعلق ہوا نہیں ادھر عیاشی کے گزٹ میں نام چھپا نہیں ،اگر بڑے بڑے لوگوں کے نام سے یہ اپنے کو نہ منسوب کریں تو اعلیٰ طبقے والی کہلائیں کیوں کر، اگر چوری چھپے تعلق کیجئے تو اس میں بھی جب تک مہینوں حاضری نہ دیجئے اور ایک کی جگہ چار خرچ نہ کیجئے کام نہیں چلتا۔تمھارے معاملے میں اتنا غنیمت ہے کہ تم یہاں کے رہنے والے نہیں ہو باہر والے کی رسائی چوری چھپے کبھی کبھی ہوجاتی

ہے کیونکہ اس میں دام بھلے چنگے ہاتھ آجاتے ہیں اور عام طور سے کمانے کا نام بھی نہیں ہوتا۔ خیر چلو ذرا ہم بھی دیکھیں۔ اسی طرف سے نیا مکان بھی دیکھتے آئیں گے، آج کئی دن سے نہیں گئے۔ تخت، پلنگ، کرسیاں وغیرہ تو پہنچ گئی ہیں ذرا دیکھنا ہے کہ کس طرح سے سجایا جائے۔ اس طرف سے کھڑے کھڑے وہاں بھی چلنا، مکان کی آرائش وغیرہ میں تمھارے سلیقے کے ہم ہمیشہ سے قائل ہیں۔

اس رنڈی کے یہاں پہنچ کر میاں عبدالمغنی صاحب نے منھ سے تو کچھ نہ کہا مگر شہامت علی کا ایسا ادب ولحاظ کیا گویا یہ ان کے ادنیٰ ملازم ہیں۔ ایک ایک گلوری نوش کی اور رئیس صاحب کی طرف سے کچھ دے کر دونوں آدمی اُٹھ آئے۔ لیجئے صاحب وہاں رنگ ہی بدل گیا۔ ادھر یہ لوگ رخصت ہوئے اور اُدھر نائکہ نے استاد گھمن خاں کو بلایا کچھ سرگوشیاں ہوئیں جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ معاملہ روبراہ ہوگیا۔ پیغام بھیجا کہ لونڈی کو حکم میں کبھی عذر تھا نہ ہے صرف بات یہ ہے کہ رات میں دوسرے کی پابندی ہے، دن کو جب چاہے گھڑی دو گھڑی کے لئے طلب کر لیجئے۔

اب دقّت آن پڑی کہ رات کے لئے تو ان کا کمرہ مناسب تھا مگر دن کے لئے بالکل ناموزوں تھا۔ عبدالمغنی کے اعزا، نوکر چاکر، لڑکے سب ہی موجود تھے۔ مناسب یہی معلوم ہوا کہ وہی نوتعمیر مکان تخلیہ کے لئے کام میں لایا جائے۔ عبدالمغنی کچہری جا چکے تھے۔ چنانچہ شہامت علی نے ایک لڑکے کو ڈورایا کہ عبدالمغنی سے اس مکان کی کنجی مانگ لائے، یہ بھی کہلا بھیجا کہ جب فرصت ہو تو خود بھی چلے آئیں۔ کنجی تو انھوں نے بھجوادی اور خود تھوڑی دیر میں آنے کو کہا۔ کلید مراد ہاتھ آگئی، اب عبدالمغنی کو کون یاد کرتا ہے انھوں نے نوکر کو تو اس رنڈی کے یہاں بھیجا خود کنجی جیب میں لے کر اس نئے مکان کی طرف چلے سب سے پہلے نل کھول کر دیکھا کہ پانی آرہا ہے۔ اس کے بعد پلنگ کی طرف متوجہ ہوئے۔ نواڑ کی پلنگڑیاں متعدد بچھی ہوئی تھیں۔ اونھ، تکیہ، بچھونا نہیں ہے نہ سہی، لوٹا بھی نہیں ہے، مگر شیشے کی الماری میں جگ اور گلاس تو ہیں، یار کچھ پان منگوانے چاہئیں۔ نوکر جب آئے گا تو وہ ہی لے آئے گا۔ شہامت علی کی بے تابی بیان کر کے اپنے پڑھنے والوں پر ناتجربہ کاری کا اتہام لگانا نہیں چاہتا۔

قصہ مختصر کچھ انتظار کے بعد معشوقہ محبوبہ تشریف لائیں۔ انھوں نے دھڑکتے دل سے استقبال کیا، نوکر کو گلوریاں، برف، لیمنڈ لینے کو بھیجا اور پاس تو بٹھالیا مگر نوکر کی واپسی کے انتظار میں دستِ ہوس اور زیادہ نہیں بڑھایا۔ ہاں جو باتیں اظہارِ شوق کی بالکل پیش پا افتادہ تھیں ان کا ذکر نہیں مگر نگاہ نوکر کے دھڑکے میں در ہی سے لڑی رہی۔ اتنے میں نوکر بھی آگیا اور اس کے ساتھ ساتھ میاں عبدالمغنی بھی دھمکے۔ ان کو دیکھ کر شہامت علی صاحب کے چہرے پر مسرت، خلوص اور شکر گزاری کا اشتہار لگ گیا۔ مگر عبدالمغنی صاحب کے چہرے پر خلافِ امید سنجیدگی، متانت بلکہ اس سے بھی بالاتر وہ کیفیت ظاہر تھی جو اس وقت ہوتی ہے جبکہ آدمی مروت کو توڑ کر کسی دوست کے خلاف دوٹوک فیصلہ کر لیتا ہے۔ شہامت علی کا دل دھک سے ہوگیا۔ رنڈی کے دوسرے پہلو میں بیٹھنے کی دعوت دی مگر عبدالمغنی نہ بیٹھے۔ ایک دوسکنڈ چپ کھڑے رہے۔ اس کے بعد کہنے لگے۔ یار سنو! تم جانتے ہو ہماری ہر چیز جان مال دوستوں کے لئے وقف ہے مگر ابھی اس مکان میں یہ کام نہیں ہوسکتا ہے۔ ابھی اس گھر میں میلاد شریف نہیں ہوا ہے۔

☆☆☆



معروف محقق، ناقد اور افسانہ نگار ڈاکٹر مجاہد الاسلام (اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، لکھنؤ کیمپس) کی تازہ ترین تنقیدی کتاب ''محاسن و معائب'' شائع ہوکر منظر عام پر آئی تو علمی و ادبی حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی حاصل کرنے میں کامیاب رہی۔ کتاب کے نام نے ہی کئی لوگوں کو چونکایا تو فن پاروں پر تنقیدی نظر ڈالنے کی ان کوششوں کو سراہا بھی۔ اتر پردیش اردو اکادمی نے اس کتاب پر ڈاکٹر مجاہد الاسلام کو انعام سے نوازا تو قومی اردو کونسل نے تھوک خریداری اسکیم کے تحت ''محاسن و معائب'' کی سو کاپیوں کو خریدنے کی منظوری بھی دی۔ آل احمد سرور اور محمود الٰہی جیسی شخصیات کی فکر کو اپنی تنقیدی ترازو میں تولنے کی ان کے زاویۂ نظر کی تاب بہت کم لوگ لا پا رہے ہیں۔ 268 صفحات پر مشتمل اس کتاب کی قیمت محض 325 روپے ہے، جس کا اسٹاک محدود ہے۔ درج ذیل نمبر پر رابطہ کر کے کتاب حاصل کی جاسکتی ہے:

9628845713

رپوٹیشن

ڈاکٹر قدسیہ بانو

(ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ کیمیا، مہیلا پی جی کالج، لکھنؤ)

آلو پندرہ کا ایک، پچیس کا دو۔ آلو پندرہ کا ایک، پچیس کا دو۔

ارے یار بیس کا تو دو کلو چل رہا ہے اور تم پچیس کا بیچ رہے ہو۔

نہیں صاحب پچیس کا دو کلو ہے۔

ارے نہیں۔ اچھا چلو بائیس کا لگا لو، دو کلو تول دو۔

چلئے لے لیجئے، لیکن ہمارا بچے گا نہیں کچھ۔

دو کلو میڈیم سائز کا تول دو۔

اَماں! دو تین ہری مرچ تو رکھ دو۔

پاپا کل میری سہیلی کا برتھ ڈے ہے، گفٹ لینا ہے۔

ٹھیک ہے بیٹی، شام کو چلتے ہیں گفٹ پیک کرالیں گے اور ممی سے بتا دینا آج رات کا کھانا باہر کھائیں گے۔

تھوڑی آؤٹنگ بھی ہو جائے گی۔

پاپا! دسترخوان چلتے ہیں!!

ٹھیک ہے آج کا ڈنر وہیں کرتے ہیں۔

سر! یہ آپ کا بل۔۔۔۔۔۔

ایک ہزار نو سو ایک روپیہ۔

بیگم: یہ ہوٹل والے بھی بڑے بنیا ٹائپ کے ہوتے ہیں، ایک روپیہ بھی نہیں چھوڑتے۔ پورا ایک ہزار نو سو ایک روپیہ کاٹ لیا، اوپر سے ٹپ الگ سے۔

ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ، ان سے تو بہتر ٹھیلے والے ہوتے ہیں جن سے پیسے کم بھی کرا لو اور کچھ تو دو چار روپیہ خود سے ہی چھوڑ دیتے ہیں۔

آپ کو ایک روپیہ نہیں دینا چاہئے تھا۔

ارے کیسے نہیں دیتے!

یہاں رپوٹیشن بھی تو دیکھنا ہوتا ہے اور یہ کم بخت اسی کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔

☆☆☆

نعت پاک

شمیم احمد شمیم (بلریا گنج، اعظم گڈھ)
Mob. 959802110

آدم کی چشمِ جاں میں بشارت کا دائرہ
لاریب و کیمیا ہے وہ بعثت کا دائرہ

کتنا بلند پایہ ہے رحمت کا دائرہ
پاکیزہ شہر مرکزِ عفت کا دائرہ

اہلِ صفا لگا لے گلے اپنے پیار سے
اللہ کی کتاب ہے سیرت کا دائرہ

مکے سے جو چلا تھا مدینے کو کارواں
تاریخ میں بدل گیا ہجرت کا دائرہ

شانِ الٰہی دیکھئے اس غارِ ثور پر
مکڑی نے بن دیا ہے حفاظت کا دائرہ

جس نے حواریوں کو بھی سلطاں بنا دیا
نایاب کیمیا ہے وہ صحبت کا دائرہ

بزمِ نشاط میں رہی سب پہ نگاہِ خاص
میرا نبی ہے ٹھنڈی طبیعت کا دائرہ

وارفتگی کی حد سے بھی آگے نکل گیا
دیکھا ہے جس نے آپکی صورت کا دائرہ

لو آگئے ہیں آمنہ وہ تیری گود میں
جس پہ ہوا ہے ختم نبوت کا دائرہ

شاہِ امم کے پیٹ پہ پتھر بندھے رہے
لیکن نہ چھوڑا صبر و قناعت کا دائرہ

ماہِ تمام آئے گا دنیا میں اے شمیمؔ
چمکا ہے آسماں پہ رسالت کا دائرہ

غزل

رفعت عزمی (بارہ بنکی)
Mob: 9451818310

آبادی گنجان بہت ہے
تنہا کیوں انسان بہت ہے

جینے کے اسباب نہیں ہیں
جینے کا ارمان بہت ہے

چہرے پر شاداب تبسم
لیکن دل ویران بہت ہے

ابنِ آدم کی فطرت میں
عجلت کا رجحان بہت ہے

شہرِ خرد کے باشندوں میں
جذبوں کا فقدان بہت ہے

ایماں ہے تخفیف پہ مائل
معبد عالی شان بہت ہے

اردو نظم و نثر پہ عزمیؔ
غالب کا احسان بہت ہے

غزل

ڈاکٹر مقبول احمد مقبول (اودگیر، مہاراشٹر)
Mob: 9028598414

کبھی میری طرف بھی اک نظر، اے رونقِ محفل!
کہ تیرے چاہنے والوں میں ہے ناچیز بھی شامل

کوئی پامال ہے یکسر تو کوئی ہے سر آنکھوں پر
یہ اپنی اپنی قسمت ہے محبت کا ہے یہ حاصل

مجھے تکلیف دینے میں مزہ آتا ہے کیا تم کو؟
کہو! کیا بات ہے آخر، دُکھاتے کیوں ہو میرا دل؟

نہیں معلوم اِس کو کیا ملا، اور اُس نے کیا کھویا
اگر مسرور ہے مقتل تو مغموم ہے قاتل

حقیقت میں کرامت ہے یہ ساری عزم وہمت کی
ارادے ہوں اگر مضبوط تو کیا چیز ہے حائل

اگر ہے ڈوبنا تقدیر میں تو یوں بھی ہوتا ہے
وہیں پتوار ٹوٹے گی قریب آیا جہاں ساحل

بلا جوہر کے کوئی کیا کسی سے فیض پائیگا
''تہی دستانِ قسمت را چہ سود از رہبرِ کامل''

غزل

ڈاکٹر فریاد آزر (نئی دہلی)
Mob: 999 0 888 234

اگر بازو نہ میرے اس قدر شل ہو گئے ہوتے
زمانہ کے مسائل خود بخود حل ہو گئے ہوتے

خدا کا شکر ہے توفیق اس نے بھولنے کی دی
وگرنہ میں ہی کیا سب لوگ پاگل ہو گئے ہوتے

تو شاید ہو نہیں پاتے کسی فن میں کبھی یکتا
تمھیں پاکر اگر ہم بھی مکمل ہو گئے ہوتے

جو ہوتے منحرف حمدوثنا سے جانور تیری
تو ریگستان میں تبدیل جنگل ہو گئے ہوتے

ہمارے ہونے کا کچھ فائدہ ہوتا جبھی شاید
کسی کے واسطے ہم صبر کا پھل ہو گئے ہوتے

چلو اچھا ہوا زحمت نہیں کرنی پڑی ورنہ
اگر سورج نہیں اگتا تو مشعل ہو گئے ہوتے

ضرورت سے زیادہ ان کو گر ٹوکا نہیں جاتا
یہی خاموش بچے شوخ، چنچل ہو گئے ہوتے

جدائی کا بہانہ بھی فراہم کر دیا اس نے
وگرنہ خود پہ ہم جبرِ مسلسل ہو گئے ہوتے

اگر گزرے ہوئے کل نے اِنہیں موقع دیا ہوتا
تو یہ بچے بھی امیدوں بھرا کل ہو گئے ہوتے

غزل

موجؔ لکھنوی

9305573948

ہے مناسب بس یہی عنواں کہانی کے لیے
مٹ رہا ہوں چاہ میں د نیائے فانی کے لیے

اب اسی کو دیکھ کر دل کو بہلاتا ہوں میں
داغ جو اس نے دیئے دل کو نشانی کے لیے

غم تو اِس کا ہے وہی آخر بکھر کر رہ گئے
خواب جو دیکھے تھے ہم نے زندگانی کے لیے

تاکہ یہ محفوظ ہوجائے جہاں کی گرد سے
کھول دو سینہ کتابِ آسمانی کے لیے

اک طرف ہے تیرا غم اور اک طرف دنیا کا غم
یہ حقیقت کے لیے ہے وہ کہانی کے لیے

گلستاں میں جس طرح ہو شاخ پر کھلتا گلاب
بس یہی تمثیل ہے تیری جوانی کے لیے

چاہے جتنے غم مجھے دے دیجئے بندہ نواز
دل مرا حاضر ہے ان کی میزبانی کے لیے

جارہے ہیں موجؔ سب ہی اپنے محور کی طرف
کون آئے اب وفا کی راجدھانی کے لیے

غزل

ڈاکٹر کہکشاں خان جلال پوری
(امبیڈکر نگر، یوپی)

وہی زندگی کا قصہ وہی موت کا فسانہ
کبھی مسکرا کے رونا کبھی رو کے مسکرانا

ہے چمن میں ایک بلبل جو یہ گنگنا رہی ہے
رہے گلستاں سلامت رہے میرا آنا جانا

کوئی سانس بھی جو چاہے تو سکوں سے لے نہ پائے
مجھے لگ رہا ہے جیسے یہ جہاں ہے قید خانہ

کہیں نفرتوں کے شعلے تجھے بھی نہ زد میں لے لیں
مرے گھر کے ہی برابر ترا بھی ہے آشیانہ

وہ زمانے بھر کی دولت طلب ہی کیوں کرے گا
اے خدا ترے کرم کا جسے مل گیا خزانہ

تری ہر ادا حسیں ہے تجھے یہ پتہ نہیں ہے
ترے دم سے ہی تو میرا ہے مزاج شاعرانہ

میں زمیں تو آسماں ہے، میں کہاں ہوں تو کہاں ہے
تجھے کیا غرض کہ سمجھے مرے درد کا فسانہ

ہمیں خامشی فضا کی یہی درد دے رہی ہے
اگر آندھیوں کا ڈر ہو تو چراغ مت جلانا

نہ وہ اب سخن میں دم ہے، نہ وہ جرأتِ قلم ہے
جو فراقؔ و میرؔ کا تھا وہ گزر گیا زمانہ

مرے دیش کی یہ دھرتی رہے اے خدا سلامت
رہے لب پہ کہکشاںؔ کے اسی ملک کا ترانہ

تبصرہ

نام کتاب: خطوطِ غالب کے ادبی مباحث (تحقیق)

مصنف: ڈاکٹر مشیر احمد

سنِ اشاعتِ دوم: 2021

صفحات: 399

قیمت: 450

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، لال کنواں، دہلی موبائل: 9899622725

مبصر: شاہد حبیب (ریسرچ اسکالر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، لکھنؤ کیمپس) موبائل: 8539054888

ڈاکٹر مشیر احمد کا شمار ہماری جامعات کے ان اساتذہ میں ہوتا ہے جو اپنی تدریسی ذمہ داریوں کی کما حقہ ادائیگی کے ساتھ ساتھ تحقیق و تدوین کے میدان میں بھی سرگرمِ عمل ہیں۔ انھوں نے غالب کے نثر پاروں اور خصوصاً خطوط کے حوالے سے جن متنوع رنگ تحقیقات کو اپنی دلچسپیوں کا مرکز بنایا ہے، وہ حیرت انگیز ہے اور قابلِ داد بھی۔ یوں تو انھوں نے اشفاق احمد عمر کے اشتراک سے "مسیح الزماں شبنم گورکھپوری" (1935-2013) کے مجموعہ ہائے کلام "پھول اور شبنم"، "اشکِ شبنم" اور "بزمِ شبنم" جیسے نادر و نایاب کارناموں کو تحقیق و تدوین کے زیور سے آراستہ کر کے 2014 میں "کلیاتِ شبنم گورکھپوری" کے نام سے مرتب کیا ہے۔ مگر ان کی شناخت کا ابھی تک کا سب سے مستحکم حوالہ زیرِ نظر تحقیقی مقالہ (خطوطِ غالب کے ادبی مباحث) کی اشاعت ہے۔ مشیر احمد نے 2006 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اپنے اس علمی مقالے کو داخل کیا تھا اور ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری سے سرفراز ہوئے تھے۔ لیکن انھوں نے اس پر مزید پانچ سالوں تک حذف و اضافہ جاری رکھا اور 2011 میں اسے منظرِ عام پر لانے کے لیے اپنے دل کو منا لیا۔ اتنی محنت شاقہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ نامورانِ ادب نے عام روش سے



ہٹے ان کے اس کام کی تحسین کی۔ جن میں شمس الرحمن فاروقی، پروفیسر رفیع الدین ہاشمی، حقانی القاسمی اور پروفیسر احمد محفوظ کے نام شامل ہیں۔ ان کے اس کام کی تعریف اس لیے بھی ہوئی ہے کہ ان سے قبل جن ماہرینِ غالبیات بشمول امتیاز علی خاں عرشی، مولوی مہیش پرشاد، آفاق حسین آفاق، غلام رسول مہر، مالک رام اور خلیق انجم نے غالب کے خطوط کی تدوین و تحقیق میں جس طرح سے خونِ جگر صرف کیا، ان سب کی خدمات کا مشیر احمد نے نہ صرف احاطہ کیا ہے بلکہ انھوں نے اپنی کتاب کے بابِ اول میں تقریباً ڈیڑھ سو صفحات میں بالتفصیل ان کا تنقیدی محاکمہ بھی کیا ہے۔ جس سے اس بحث کی بہت سی غلط فہمیوں کا واضح انداز میں ازالہ ہو جاتا ہے۔

مثال کے طور پر مولوی مہیش پرشاد اور غلام رسول مہر نے خطوط غالب کے اپنے مجموعے میں اس التزام کے دعوے کیے تھے کہ غالب نے اپنے خطوط میں جہاں جہاں ہجری تاریخ رقم کیا ہے، ان مقامات پر ان محققین نے تاریخوں کی تطبیق عیسوی کلینڈر سے کر دی ہے لیکن مشیر احمد نے اپنی کتاب کے صفحہ نمبر 118 میں صراحت کی ہے کہ "دو مقامات ایسے ہیں جہاں مہر سے کوتاہی ہوگئی ہے"۔ اپنے پیش رو محققین کے کاموں کو اتنی باریکی سے دیکھنے کی وجہ سے کسی نئے محقق کے کام میں انفرادیت کا رنگ بھی آتا ہے اور ان کا کام بھی قابلِ اعتبار ٹھہرتا ہے۔

ڈاکٹر مشیر احمد نے غالب کے خطوط کے لسانی مباحث کے تحت تحقیقِ لغات کے ذیل میں مرکبات، تذکیر و تانیث اور دیگر متفرق موضوعات سے متعلق مباحث کو خطوطِ غالب سے کشید کیا ہے اور ان پر دادِ تحقیق دی ہے۔ جیسے: ہمارے یہاں اردو میں "قلم" کو لے کر بڑی بحث چلی ہے کہ قلم کا استعمال تذکیر اولیٰ ہے یا تانیث؟ مشیر احمد نے غالب کے خطوط میں سے چھان پھٹک کر یہ بتایا ہے کہ "غالب نے تین جگہوں پر اس بحث سے متعلق اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ پہلے خط میں انھوں نے قلم کو مشترک الفاظ میں شمار کیا ہے جبکہ بعد کے دو خطوط میں قلم کے مذکر استعمال کو صحیح مانا ہے" (صفحہ 208-209)۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا

جا سکتا ہے کہ قلم کے استعمال کو لے کر غالب کی سوچ نے ارتقائی مراحل طے کیا ہے۔ پہلے پہل وہ دونوں ہی استعمال کو جائز سمجھتے رہے ہیں لیکن پھر بحث وتمحیص کے نتیجے میں انھوں نے "قلم" کے مذکر استعمال پر شرح صدر اور اطمینان حاصل کر لیا۔ مشیر احمد کہتے ہیں کہ "تذکیر وتانیث کا کوئی قاعدہ نہیں ہے، جس کے کانوں کو جو اچھا لگے وہ استعمال کر لے" (ص: 209)۔ لیکن ان کی اس رائے سے شاید ہی ماہرین لسانیات اتفاق کریں۔ کیونکہ اگر یہ بات ایسی ہوتی تو خود غالب جیسے ماہرِ لسانیات کا درجہ حاصل نہ کر پانے والے شاعر کو اس بحث میں حصہ لینے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔

ڈاکٹر مشیر احمد نے ادبی مباحث کے تحت تفہیمِ شعر کے ذیل میں غالب کے اشعار کی تشریح وتوضیح کے مبحثوں کو ان کے خطوط سے نکال کر پیش کیے ہیں۔ جس میں خود غالب کے اشعار کی تشریحات (اردو و فارسی کے اشعار علیحدہ علیحدہ فصل میں) اور ساتھ ہی دوسرے شعراء کے اشعار کی توضیحات بھی اس مبحث میں شامل ہیں۔ غالب نے خطوط کے ذریعے اپنے شاگردوں کی ایماء پر ان کے لیے اصلاحِ شعر کی جو روایت ڈالی تھی اور اس سلسلے میں جس طرح سے عام وخواص کے لیے اپنے علم کا دروازہ وا کیا تھا، مصنف نے ان سبھی مباحث کو ذیلی ابواب بندی کی صراحت کے ساتھ اس باب میں سمیٹا ہے۔ جس سے غالب کی ان آراء سے استفادہ مزید آسان ہو گیا ہے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے علم قافیہ، علم عروض، علم بلاغت سے متعلق بحثوں کو بھی اپنی کتاب میں قرینے سے سجا دیا ہے۔ غالب نے اردو شعراء کی تنقید پر کوئی تصنیف یادگار نہیں چھوڑی تھی۔ لیکن انھوں نے اپنے خطوط میں جس طریقے سے اپنے شاگردوں کے استفسار پر سودا، ناسخ، آتش، میر، مومن، قائم، ذوق، انشاء، رند، میر حسن، داغ، جعفر زٹلی اور حالی جیسے شعراء کے تعلق سے گفتگو کی تھی، وہ بہت سی تنقیدی کتابوں پر بھاری ہے۔ کیوں کہ بعض ایسی شخصیتیں ہوتی ہیں، جن کا ایک جملہ ہی کسی کے لیے سند کا درجہ حاصل کر سکتا ہے اور غالب جیسے عظیم المرتبت شاعر کے ایک ایک مصرعے ہی کئی دفعہ ضخیم کتابوں پر بھاری ہونے کی بات ہمارے نقاد تسلیم کر چکے ہیں۔ مشیر احمد کی اس تحقیقی کتاب کے مباحث اور اس کی ترتیب کے تنظیمی اسلوب کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ نقادانِ ادب کو غالب کی تنقیدی آراء کو پرکھنے اور ان کو بطورِ مسلم تنقید نگار تسلیم کرنے میں دیر نہیں لگے گی۔ کیونکہ انھوں نے اس بحث کو جس کلاسیفائیڈ انداز میں پیش کیا ہے، اس سے ہمارے تنقید نگاروں کو غالب کے اقتباسات سے بہرور ہونے کے لیے خلیق انجم کی مرتب کردہ خطوط غالب کی چار ضخیم جلدوں کو پلٹنا نہیں پڑے گا۔

ڈاکٹر مشیر احمد نے نہ صرف اردو شعراء کے حوالے سے غالب کی تنقیدی آراء کو جمع کیا ہے بلکہ فارسی شعراء (حزیں، صائب، ظہوری، نظیری، سعدی، انوری، عرفی، خاقانی، قدسی، خسرو، فیضی، نظامی، فردوسی، مغربی اور حافظ) کے حوالے سے کی گئی گفتگو کو بھی جمع کر دیا ہے جس سے فارسی انتقادیات سے غالب کی عالمانہ واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ قتیل، مولوی غیاث الدین رام پوری، حکیم محمد حسین دکنی جیسے معروف وغیر معروف لغت نویسوں کے تعلق سے غالب نے جن خیالات کا اظہار کیا تھا، انھیں بھی ایک مستقل فصل میں مصنف نے سلیقے سے سجا دیا ہے۔ اور آخری باب میں "غالب کے خطوط کے دو اہم بنیادی مسائل" کے عنوان سے تحقیق وتدوین اور اردو تنقید کے ذیل میں جو مسائل درپیش رہے ہیں، ان کو بھی مشیر احمد نے خوش اسلوبی کے ساتھ موضوعِ بحث بنایا ہے۔ پانچ صفحات پر مشتمل کتابیات کی طویل فہرست اس بات کی گواہی کے لیے کافی ہے کہ اس تحقیقی کتاب کی تیاری میں کس قدر بنیادی وثانوی مراجع سے استفادہ کیا گیا ہے اور اس کے لیے کتنی عرق ریزی کی گئی ہے!

دس سال کے قلیل وقفے میں کسی تحقیقی کتاب کے دوسرے ایڈیشن کی نوبت آجانا اور مصنف کا جامعہ ملیہ اسلامیہ میں رہ کر تدریسی ذمہ داریوں کی ادائیگی ساتھ ساتھ اس میں خاطر خواہ اضافے کے لیے تیار رہنا تحقیق اور محقق دونوں کے اعتبار میں اضافے کا باعث ہے اور قاری کو اس کے استقبال کے لیے مجبور بھی کرتا ہے۔ امید ہے دیدہ زیب سرورق کی حامل اس نئے ایڈیشن کو بھی ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔ کیونکہ مشیر احمد کے بحرِ قلم سے غالب کے پرستاروں کو ایک نیا نگینہ ہاتھ لگ گیا ہے۔

***

تبصرہ

نام کتاب: اجالوں میں سفر-تحریک اسلامی کے ساتھ نصف صدی (خودنوشت)

مصنف: انتظار نعیم

سن اشاعت: 2021

صفحات: 424 **قیمت:** 500 روپے

ناشر: شاہکار پبلشرز، بلیماران، دہلی: 110006۔موبائل: 9810686944

مبصر: شاہد حبیب (ریسرچ اسکالر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، لکھنؤ کیمپس) موبائل: 8539054888

انتظار نعیم (پ: 1944، ضلع بستی، یوپی) ہماری شعری روایت کے اس روشن حصے کے امین ہیں جو حالی، شبلی، آزاد، ماہر القادری، نعیم صدیقی، عامر عثمانی اور حفیظ میرٹھی جیسے نابغۂ روزگاروں نے وراثت میں چھوڑی ہیں۔ انھوں نے شعر و ادب کے اکتسابات کو سماج اور معاشرے کی تعمیر کا وسیلہ جانا اور اسی طرز سے اپنی زندگی کی ساعتوں کو مقصدِ حیات کے استحضار کے ساتھ گزارا، جس طرح قرنِ اول میں ہمارے متقدمین نے گزارا تھا۔ انتظار نعیم، عرصہ دراز تک ادارہ ادب اسلامی ہند جیسی واضح نصب العین کی حامل ادبی تحریک کے جنرل سکریٹری و نائب صدر، اور اس کے ترجمان "ماہنامہ پیش رفت" نئی دہلی کے مینجنگ ایڈیٹر کے طور پر نگراں رہے۔ اس طرح وہ دو دہائی سے زائد مدت تک اپنی خدمات پیش کرتے ہوئے تین نسلوں کی ادبی تربیت کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے مشہور انگریزی ہفت روزہ "ریڈینس ویوز ویکلی" کے 1986 سے 2006 تک ڈائریکٹر رہے۔ دو شعری مجموعے "شرطِ وفا" 2008 میں اور "بُنے ہیں خواب کچھ میں نے" 2013 میں منظر عام پر آکر قارئین و ناقدین سے داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ برادرانِ وطن میں ان کی شناخت کا سب سے بڑا حوالہ ان کی ہندی تصنیف "دلت سمسیا : جڑ میں کون؟" جیسی سماجیات کی تحقیقی کاوش کی اردو اور تلگو اشاعتیں ہیں۔ ان کے علاوہ بھی ڈیڑھ درجن سے زائد تصنیفات و تالیفات ان کے علم و ادب سے گہرے شغف کی گواہی دیتی ہیں۔ ان کی پچھتر سالہ سرگرم زندگی کی شاہدان کی تازہ تصنیف "اجالوں میں سفر: تحریک اسلامی کے ساتھ نصف صدی" کے نام سے منظر عام پر آئی ہے جو ان کی دل نشین خودنوشت کا غالباً پہلا حصہ ہے۔ امید ہے جلد ہی دوسرا حصہ بھی منصۂ شہود پر آجائے گا۔



"اجالوں میں سفر" کی کہانی انتظار نعیم کی ممبئی کی زندگی سے شروع ہوتی ہے جس کا آغاز 1965 کے آس پاس تحریک اسلامی سے ان کے تعارف کے پس منظر میں ہوتا ہے۔ اس کے بعد کن مراحل سے گزر کر تحریک کی رکنیت حاصل ہوتی ہے اور کس طرح سے وہ ممبئی سے دہلی پہنچتے ہیں، ایمرجنسی (1975-1977) کے دور میں ملک بھر میں پھیلے تحریک کے وابستگان کی خبر گیری کے لیے کیسے آگے آتے ہیں، آر ایس ایس کے اعلیٰ رہنماؤں کے ساتھ ساتھ اس کے کارکنان کے رابطے میں کس طرح آتے ہیں اور ان سے کس نوع کی گفتگو ہوتی ہے، ساتھ ہی ان کے سامنے پیغامِ حق کس انداز میں واضح کر پاتے ہیں، یو۔کے، امارات، قطر، پاکستان، بنگلہ دیش اور سری لنکا کے بشمول ایک درجن سے زائد ممالک کا سفر کس پس منظر میں ہوتا ہے، آر ٹی آئی کو کیسے وقف املاک کی بازیابی اور اہم ملی و ملکی مسائل کے حل کے ہتھیار کے بطور استعمال کرتے ہیں، برادرانِ وطن اور خاص کر دلت طبقہ سے مراسم کیسے استوار کرتے ہیں اور تحریک اسلامی کی کن ذمہ داریوں سے کماحقہ سبکدوش ہورہے ہیں، یہ اور اس نوع کے بے شمار مسائل و واقعات کو 172 ذیلی عناوین کی شکل میں سجا کر تاریخی دستاویز کی ایک انسائیکلو پیڈیا کی تصویر ہے انتظار نعیم کی یہ خودنوشت "اجالوں میں سفر: تحریک اسلامی کے ساتھ نصف صدی"۔

اگر خودنوشت کی موجودہ شعریات کو بنیاد بنا کر اس خودنوشت کو قاری پرکھنے کی کوشش کرے تو شاید کچھ سوالیہ نشان اس کے سامنے کھڑے ہوں گے، کیونکہ سر رضا علی کے "اعمال نامہ" (اشاعت اول: دسمبر 1943) سے لے کر پروفیسر شارب ردولوی کی خودنوشت "نہ ابتداء کی خبر ہے، نہ انتہا معلوم" (اشاعت اول: 2021) تک، اردو خودنوشتوں کی اس 78 سالہ روایت میں جس غالب اسلوب اور طریقۂ کار کا التزام کیا گیا ہے، اس کی پاسداری انتظار نعیم کی اس خودنوشت میں نہیں کی گئی ہے۔ یعنی پیدائش اور خاندانی پس منظر، تعلیم کے مختلف مراحل کا ذکر اور زندگی کے دیگر گوشوں پر روشنی ڈالنے کی روایت ہمارے یہاں کی خودنوشتوں میں رہی ہے۔ لیکن اس کے برخلاف انتظار نعیم کی اس خودنوشت کا آغاز ہی ہوتا ہے ان کی زندگی کے اکیسویں پڑاؤ سے، اور خودنوشت میں وارد واقعات کا دائرہ مرکوز ہے تحریک اسلامی کے محور میں۔ شاید اسی محور

کے جواز کے طور پر انتظار نعیم نے "اجالوں میں سفر" جیسے خوبصورت نام کے آگے "تحریک اسلامی کے ساتھ نصف صدی" کا لاحقہ ضروری سمجھا۔ تاکہ قاری کو کسی بھی نوع کے وہم کی کیفیت سے دوچار نہ ہونا پڑے۔ ویسے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ خودنوشت نگار کی زندگی تحریک اسلامی کی رفاقت کے سوا کچھ تھی بھی نہیں، تو ایسے میں اس کے علاوہ دیگر بیانات کی گنجائش ہی کہاں تھی! ورنہ وہ اسے خودنوشت کے بجائے تحریک اسلامی کی یادداشت کے طور پر متعارف کرا سکتے تھے۔ لیکن اسلوب اور تکنیک کے اس تجربے کے باوجود قاری جب اس خودنوشت کی قرات کا آغاز کرتا ہے تو آخری سطروں تک پہنچتے پہنچتے وہ فن کار کی پیدائش، خاندانی پس منظر، بچپن، تعلیم کے مختلف مراحل، اسفار اور دیگر دلچسپیوں سے بھی واقفیت حاصل کر لیتا ہے اور ایک طرح کی سرشاری کے احساس میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہا سکتا ہے کہ انتظار نعیم کی یہ خودنوشت اپنی طرز و اسلوب کی اب تک کی واحد خودنوشت ہے اور یہی اس کی انفرادیت کا سبب بھی ہے کہ خودنوشت کی مروجہ شعریات کا التزام نہ کیے جانے کے باوجود یہ ایک مکمل خودنوشت ہے اور اپنی طرز کا موجد بھی۔

انتظار نعیم کے اولین شعری مجموعے "شرطِ وفا" پر بات کرتے ہوئے معروف فکشن نگار اقبال انصاری نے لکھا تھا کہ "انتظار نعیم کا کلام پڑھنے کے بعد یہ فیصلہ کرنا مشکل نہیں ہے کہ انھیں پابند غزل کا بڑا شاعر کہا جائے یا آزاد نظم کا منفرد شاعر! "شرطِ وفا" کا تخلیق کار پابند غزل کا بڑا شاعر بھی ہے اور آزاد نظم کا منفرد شاعر بھی"۔ انتظار نعیم کی خودنوشت کی زبان کی بات کریں تو بلا کسی تردد کے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ فن کار کو آزاد نظم کہنے پر جو قدرت حاصل تھی، اس کا ایک بار پھر کامیاب تجربہ انھوں نے اپنی خودنوشت میں کیا ہے۔ تصنیف کا ہر صفحہ کسی نہ کسی واقعے کے حوالے سے قاری کو سوچنے اور غور و فکر کرنے کی طرف راغب کرتا نظر آتا ہے۔ یعنی مصنف نے فکر کی سطح پر اور ساتھ ہی زبان کے اعتبار سے بھی نئے تجربات سے قاری کو چونکایا ہے۔ ایمان و یقین کی حلاوت سے محظوظ کرنے کی شعوری کوشش کی گئی ہے اور تعمیری فکر کی کارفرمائی کو برتنے کا وسیلہ خودنوشت کو بھی بنایا گیا ہے۔ دراصل "اجالوں میں سفر" نہ صرف ہندستان میں تحریک اسلامی کی تاریخ کے ایک معتبر حوالے کے طور پر یاد رکھے جانے کے قابل ہے بلکہ اس میں ہندستانی مسلمانوں کی ملی تاریخ کا بہت سارا خام مواد بھی پنہاں ہے۔ اسی لیے جماعت اسلامی ہند کے امیر، انجینئر سید سعادت اللہ حسینی نے اس خودنوشت کی رسم اجرا (28 نومبر 2021) کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ "اجالوں میں سفر، ایسی کتاب ہے جو تاریخ کا سرچشمہ ثابت ہوسکتی ہے اور آنے والی نسلوں کو متاثر کرنے کی قوت بھی رکھتی ہے"۔ کتاب کے اختتام پر قاری سید سعادت اللہ حسینی کی بات میں صداقت کے عناصر کو موجود پاتا ہے۔ انتظار نعیم نے شعر وادب کی تخلیق اور ادبی تحریک کی سربراہی کے ساتھ ہی ساتھ دیگر ملی، قومی، سماجی وصحافتی سرگرمیوں میں بھی اپنی زندگی کو کھپایا اور ایک مکمل زندگی جینے کا حوصلہ دکھایا ہے، اس لیے ان کی زندگی کے نشیب و فراز میں ملی و قومی زندگی کے نشیب و فراز کا عکس جا بجا نظر آتا ہے اور یوں وہ اقبال کے مردِ مومن کے جیتے جاگتے نمونے کے طور پر سامنے آتے ہیں۔

ہندستان کے مظلوم و پسماندہ طبقات میں اسلام کے پیغام اور انسانی اخوت کے رشتے کو عام کرنے کی کوششیں ہوں یا مدھر سندیش سنگم کی بنیاد ڈالنا، وقف املاک کی بازیابی کے مسائل ہوں یا فسادات میں ملت کی طرف سے فرضِ کفایہ کی ادائیگی کا معاملہ، ارضِ فلسطین کی حریت کے لیے جد وجہد ہو یا بابری مسجد کے تحفظ کی کوششیں، عرب بہار یہ کو صحیح رخ دے کر ملت کی کشتی کو سبز ساحل عطا کرنے کا خواب ہو یا مسلم پرسنل لا کے لیے ہندستانی مسلمانوں میں بیداری لانے کی مہم، ہر جگہ انتظار نعیم نے اپنی باوقار موجودگی درج کرائی ہے اور یہ سبھی موجودگی پورے تاریخی حوالوں کے ساتھ ان کی خودنوشت میں من وعن آگئی ہیں، اس طرح خودنوشت کے اعتبار میں افزونی کی گونا گوں کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ اسی لیے کتاب میں تبریک ثبت کرتے ہوئے معروف ماہرِ اقبالیات پروفیسر عبدالحق نے بجا طور پر لکھا ہے کہ "انتظار نعیم صاحب نے واقعات ومشاہدات کو اثر آفریں پیرایۂ بیان سے ہم آہنگ کیا ہے۔ گویا نگارشِ قلم کو زندگی کے سوز و ساز سے آراستہ کیا ہے" (ص:14)۔

راقم نے گزشتہ سطروں میں انتظار نعیم کی اس خودنوشت کو ان کی یادداشتوں کا حصہ اول اس لیے بھی کہا کہ انھوں نے ذیلی عنوان نمبر 154 کے تحت "رہبرِ کارواں مولانا ابوللیث" کا ذکر کرتے ہوئے صفحہ نمبر 359 سے لیکر 365 میں ملک کے مختلف گوشوں کی 124 شخصیات کے اسماء کی فہرست پیش کی ہے اور عندیہ ظاہر کیا ہے کہ آسانیاں ہونے پر وہ ان شخصیات سے جڑی یادوں کو بھی نئی نسل کے حوالے کریں گے، اس لیے امید کی جاتی ہے کہ ان کی بھرپور ادبی و ملی زندگی کے کارناموں پر مشتمل خودنوشت کے اِس حصے کی بھی پذیرائی ہوگی اور آنے والے حصوں کی بھی۔

***

محترمی ومکرمی ایڈیٹر صاحب/ سہ ماہی ادبی نشیمن لکھنؤ
آداب وتسلیمات

ادبی نشیمن کا دسمبر تا فروری 2022 کا شمارہ ملا، دیکھ کر خوشی ہوئی کہ آپ نے ناچیز کے مضمون ’رضیہ سجاد ظہیر کے افسانوں کا فکری مطالعہ: بادشاہ اور معجزہ کے حوالے سے‘ کو شائع فرمایا ہے۔ آپ نے ایڈیٹوریل اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے مضمون کے عنوان کو قدرے تبدیل کیا ہے۔ یہ اول وہلہ میں ذرا گراں گزرا لیکن بعد میں یہ تبدیلی مناسب ہی معلوم ہوئی۔

آپ نے اپنے اداریے میں اتر پردیش اردو اکادمی کی فعالیت کو لے کر جو کچھ کہا ہے اور جن نئے کاموں کی طرف توجہ دلائی ہے، وہ قابل تعریف ہے اور ضروری بھی۔ ایک زمانہ تھا جب اتر پردیش اردو اکادمی ملک بھر کی اکادمیوں میں سب سے فعال اور تحقیقی رفتار کے حوالے سے مثالی سمجھی جاتی تھی۔ لیکن آج اکادمی نے اپنی اندرونی سیاست کا شکار ہو کر بہت کچھ کھو دیا ہے۔ جو قابل افسوس ہے۔ جس طرح سے آج دہلی اردو اکادمی کو ملک بھر میں ایک منفرد شناخت حاصل ہے، اسی طرح سے پروفیسر محمود الٰہی کے زمانے میں اتر پردیش اردو اکادمی کو امتیازی شناخت حاصل تھی۔ آپ نے اپنے اداریے میں جن باتوں کی طرف توجہ دلائی ہے اور جو لائحہ عمل پیش کیا ہے اگر تیزی کے ساتھ اکادمی کے ارباب اختیار ان کو روبہ عمل لانے لگیں تو بعید نہیں کہ جلد ہی اتر پردیش اردو اکادمی بھی اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ ہم اور آپ تو خواہش اور دعا ہی کر سکتے ہیں۔

زیر نظر شمارے کے مضامین کا سیکشن کافی معلوماتی ہے۔ مضمون نگاروں نے تو معیاری مضامین لکھے ہی ہیں لیکن آپ کے ایڈیٹوریل ٹچ نے ان مضامین کو مزید معیاری اور خوبصورت بنا دیا ہے۔

برادر عزیز شاہد حبیب کا مضمون ’قرۃ العین حیدر کے افسانے اور حقوق انسانی کے مسائل‘ ایک نئے زاویے سے قرۃ العین کے افسانوں کی قراءت کی طرف دعوت دینے میں کامیاب نظر آتا ہے۔ ادبی نشیمن کا یہ امتیاز بھاتا ہے کہ نئے پرانے اسکالرز کے توازن کو برقرار رکھنے میں یہ رسالہ اپنی مثال پیش کر رہا ہے۔ رسالے میں شامل مجتبیٰ حسن صدیقی کی غزل نے ان کی شاعری کے جداگانہ تیور کی طرف کامیاب اشارہ کیا۔ بطور خاص یہ شعر کہ: ایک بھی موقع نہیں دیتی کسی کو زندگی اور ہم جیسوں کو یہ موقع دوبارہ چاہیے۔

کیا خوبصورت شعر ہے۔ مجتبیٰ حسن صدیقی کو ناچیز کی طرف سے ہزار ہا داد اور ان کی فکری وفنی ریاضتوں کو سلام۔

شکریہ مخلص: ڈاکٹر محمد جابر حمزہ
گیسٹ فیکلٹی، شعبۂ اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

محترمی ومکرمی ایڈیٹر صاحب/ ادبی نشیمن، لکھنؤ تسلیمات

شکر ہے آج لکھنؤ سے بہت سے ادبی رسائل شائع ہو رہے ہیں۔ ادبی نشیمن بھی لکھنؤ سے ہی شائع ہونے والا ایک علمی وادبی رسالہ ہے۔ یہ رسالہ ڈاکٹر سلیم احمد صاحب کی ادارت میں ہر تین ماہ پر پابندی کے ساتھ منظر عام پر آتا ہے اور علمی تشنگی کو بجھانے کا سبب بنتا ہے۔ اس وقت دسمبر تا فروری 2022 کا شمارہ میرے پیش نظر ہے۔ اس میں شائع تمام تحریریں پختہ اور معیاری ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس میں نئے لکھنے والوں کو بھی فراخ دلی کے ساتھ جگہ دی جاتی ہے اور خاطر خواہ اصلاح بھی کی جاتی ہے تاکہ مضمون معیاری بن سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ادبی نشیمن نے اپنی خصوصیات کے دم پر بہت جلد ادبی دنیا میں مقبولیت حاصل کر لی ہے۔ یہ فال نیک ہے اور اس کا سارا کریڈٹ مدیر محترم اور ان کے معاونین کو جاتا ہے۔ جن کی کوششوں کی بدولت رسالہ ادبی افق پر روشنی بکھیرنے میں کامیاب نظر آ رہا ہے۔ ’بدلتے موسم کا قہر‘، ڈاکٹر عارف انصاری صاحب کا افسانہ ہے جو ادبی نشیمن کے زیر نظر شمارے کی زینت بننے میں کامیاب ہوا ہے۔ اچھا افسانہ ہے۔ موضوع اور تکنیک توجہ کھینچنے میں کامیاب رہی ہے۔ خواہش کروں گی کہ افسانے کے اکلوتے پن کو ختم کر کے اگلی اشاعتوں میں مزید کچھ افسانوں کو جگہ دی جائے۔ ادبی نشیمن جہاں نثری صلاحیتوں کو نکھارنے کا ایک بہترین پلیٹ فارم ہے۔ وہیں اس نے ذوق شاعری کو جلا بخشنے میں بھی کوئی کسر چھوڑ نہیں رکھی ہے۔ خوشی ہے کہ اس شمارے میں چھ خوبصورت غزلوں کو بھی جگہ ملی ہے۔ ان غزلوں کے شعراء دور حاضر کے چنیدہ شعراء کی صف میں شمار کیے جانے کے لائق ہیں۔ کیونکہ ان میں سے کچھ شعراء کی تو کئی کئی شعری مجموعے بھی منظر عام پر آ چکے ہیں۔ جیسے ذکی طارق، افتخار راغب اور عبرت مچھلی شہری صاحب۔ باقی شعراء نے کم لکھا، مگر جتنا لکھا اور جو لکھا، وہ معیاری اور عمدہ ہیں۔ اس کے ساتھ ہی دو عمدہ کتابوں پر بہترین تبصرے شامل ہیں۔ بے شک یہ نہایت مدلل اور مبسوط تبصرے ہیں اور اردو کے طلبہ کیلئے ان کتابوں کو سمجھنے میں رہنما ثابت ہوں گے۔

رسالہ ڈاکٹر سلیم احمد صاحب کے اداریے سے شروع ہو کر دستاویز کے معلوماتی صفحہ پر ختم ہوتا ہے۔ ادبی نشیمن کے مدیر اور تمام معاونین کو اس خوبصورت رسالے کی اشاعت پر دل سے مبارک باد اور دعائیں۔ ناز کرتا ہے زمانہ، ناز کو بھی ناز ہے تو بلندی پر رہے، یہی دل کی آواز ہے۔ شکریہ والسلام عافیہ حمید

ریسرچ اسکالر، خواجہ معین الدین چشتی لسان یونیورسٹی، لکھنؤ۔

بخدمت گرامی قدر محترم ڈاکٹر سلیم احمد صاحب/ زیدت فیوضکم،
مدیر سہ ماہی ادبی نشیمن سلام مسنون

برادرم شاہد حبیب فلاحی کے توسط سے ادبی نشیمن کا تازہ شمارہ باصرہ نواز ہوا، سرورق نہایت خوبصورت، دلکش اور جاذب نظر ہے۔ اس کے لیے موصوف صرف لائق تحسین وتبریک ہی نہیں بلکہ قابل مبارکباد اور فخر ومباہات ہیں۔ علاوہ ازیں رسالہ مشمولات کے اعتبار سے بھی خوب سے خوب تر اور منفرد وممتاز ہے اور ایک معیاری رسالہ ہونے کا ثبوت پیش کر رہا ہے، جس میں مدیر محترم کی شب وروز کی جگر کاوی کا بڑا دخل ہے۔ دور حاضر میں اردو کا اخبار جاری کرنا یا کوئی اردو مجلہ وجریدہ نکالنا جوئے شیر لانے اور پہاڑوں سے نہر کھودنے کے مترادف ہے، ایسے حالات میں ادبی نشیمن کا پابندی سے وقت پر شائع ہونا راقم کے نزدیک خوش آئند ہے اور اُردو کے روشن مستقبل کا ایک خوبصورت اعلامیہ ہے۔ یہ کہنے میں کوئی ہچک نہیں کہ اُردو کے دیگر جرائد کے مقابلے ادبی نشیمن اُردو ادب کی ترویج وترقی میں نمایاں کردار ادا کرنے کے ساتھ ساتھ اپنا ممتاز مقام بنانے میں بھی کامیاب وکامران نظر آتا ہے۔ یہ میری کوئی رسمی مدح سرائی نہیں بلکہ حقیقت بیانی ہے۔ سال گزشتہ ناچیز کا بھی ایک مضمون ادبی نشیمن میں جگہ بنانے میں کامیاب ہوا تھا، اس عنایت کے لیے شکر گزار ہوں اور شکریے کی ادائیگی میں تاخیر کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ ساتھ ہی ناچیز مدیر محترم کا مشکور وممنون بھی ہے اور مستقبل کے لیے منتظر کرم بھی۔ فقط والسلام

سفیان احمد انصاری
ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ المتوطن: ناظر پورہ، بہرائچ (یوپی)۔
موبائل: 9839574196

محترم المقام مدیر ادبی نشیمن/ حفظہ اللہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

سہ ماہی ادبی نشیمن کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ ورق گردانی سے اندازہ ہوا کہ یہ ایک ایسا رسالہ ہے جو ہر تین ماہ بعد عالم ادب میں منظر عام پر آ کر اپنی مقبولیت کے پرچم کو بلند کرتا ہے۔ ۶۴ صفحات پر مشتمل رسالے کی فہرست پر ایک طائرانہ نظر ڈالی تو دل خواہش ہوئی کہ صرف فہرست ہی کیوں، اصل مواد کا بھی رخ کروں اور پر کیف نشیمن سے بھرپور لطف اندوز ہوں۔ پھر کیا تھا دھیرے دھیرے صفحات کھولتی گئی اور مختلف النوع مضامین، نعت، حمد، تبصرے، افسانے اور غزل سے محظوظ ہوتی رہی۔ نشیمن کے آغاز میں حمد ربانی اور نعت نبی نے دل میں عظمت الٰہی اور عشق رسول کی چنگاری کو فروزاں کر دیا اور ساتھ ہی ساتھ یہ احساس بھی دلایا کہ نشیمن تو حید ورسالت کی سرشاری سے خالی نہیں ہے۔ اس کے بعد ایڈیٹر صاحب کے نظریے کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوا کہ شعراء وادبا کے لئے وظیفے کی رقم میں بڑھوتری کس قدر ضروری ہے۔ نظریے کے مطالعے کے بعد نظریں جب اگلے صفحات پر مرکوز ہوئیں تو دس سے زائد اصحاب قلم کے علمی مضامین سے جا ٹکرائیں۔ جن میں ڈاکٹر نارائن پانیدار کا ’نظیر اکبر آبادی کی شاعری میں حقیقت نگاری‘، ڈاکٹر شریف الدین خان کا ’تحقیق وتنقید کے باہمی رشتے اور عصری تقاضے‘، ڈاکٹر فائزہ خان کا ’سرسید: جہان تازہ کی افکار سے تازہ ہے نمود‘، ڈاکٹر محمد رضی الرحمن کا ’فراق گورکھپوری کی شعری انفرادیت‘، ڈاکٹر محمد جابر حمزہ کا ’رضیہ سجاد ظہیر کے افسانوں کا فکری مطالعہ‘ اور شاہد حبیب کا ’قرۃ العین حیدر کے افسانے اور حقوق انسانی کے مسائل‘ جیسے مضامین نے زیادہ توجہ کھینچی۔ باقی مضامین میں بھی قارئین کے لئے دلچسپی کے سامان موجود ہیں۔ شمارے میں مختلف موضوعات پر علمی ذخیرے اکٹھا کئے گئے ہیں۔ مجموعی طور سے مضمون نگاروں کی محنت ولگن اور قلکاروں کی زبردست علمی سوچ کی عکاسی بھی نظر آتی ہے۔ نشیمن میں ڈاکٹر عارف انصاری کا ایک خوبصورت افسانہ بھی شامل ہے جس کا نام ’بدلتے موسم کا قہر‘ ہے۔ افسانے کی محور کن فضا سے نکلنے کے بعد اہم شعراء (ذکی طارق، افتخار راغب، مجتبیٰ حسن صدیقی، محبوب خان اصغر، سید محمد نور الحسن نور نوابی عزیزی) کی غزلیں پیش کی گئی ہیں۔ ان غزلوں سے شعراء کے جذبات کا بھرپور اظہار ہو رہا ہے اور ان کے انداز بیان نکھر کر سامنے آ رہے ہیں۔ نشیمن میں دو کتابوں کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ ان میں مبصرین نے کتابوں کی خوبیوں اور خصوصیات کو اچھوتے انداز میں بیان کیا ہے۔

الغرض پورا کا پورا نشیمن اپنے اک اک صفحے سے ایک نئی اور ضروری معلومات قارئین کے لئے فراہم کرنے کا سبب بن رہا ہے۔

دعا گو ہوں کہ نشیمن اور اہل نشیمن یوں ہی مقبولیت کے منازل طے کرتا رہے اور اعلی ادب کو منظر عام پر لاتا رہے۔ آمین! شکریہ والسلام

دعا گو: سدرہ علی احمد (فتحپور (یوپی)

سلام لکھنؤ آئینہ ثقافت و دیگر تنظیموں کی جانب سے پریس کلب میں تہنیتی پروگرام

ڈاکٹر سلیم احمد اور ڈاکٹر اکبر علی شان اودھ ایوارڈ سے سرفراز



لکھنؤ۔(نامہ نگار)۔زبان و قلم کا رشتہ بہت قدیم ہے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں انسان کو علم حاصل کرنے کی ہدایت دی ہے جس سے انسان علم کے ذریعے دوسروں کی رہنمائی کرتا ہے یہ خدمت بھی ہے اور ضرورت بھی۔جو لوگ قلم کے ذریعے کسی بھی طرح کی خدمت انجام دے رہے ہیں وہ یقیناً قابل مبارکباد ہیں۔ وہ اللہ کے احکام پر عمل درآمد کرتے ہیں اور اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں ان کی اس خدمت کی ستائش اور وسیلے کے طور پر جو اعزازات اور انعامات ملتے ہیں یقیناً وہ حوصلہ افزائی اور عزت افزائی کا بہترین ذریعہ ہے۔اسی کے ساتھ ساتھ وہ تمام لوگ جو اہل قلم کی عزت افزائی کرتے ہیں وہ بھی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

ان خیالات کا اظہار پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے مشہور و معروف ادبی و سماجی خدمت گار رشید اطہر نبی نے کیا۔یہ پروگرام آج پرنٹ میڈیا جرنلسٹ ایسوسی ایشن اور سلام لکھنؤ آئینہ ثقافت کے اشتراک سے اتر پردیش پریس کلب میں منعقد ہوا جبکہ تقریب میں مہمان ذی وقار علمی ،سماجی اور سیاسی رہنما سید بلال نورانی اور مہمان خصوصی ڈاکٹر آدرش ترپاٹھی شریک رہے ۔اپنی صدارتی تقریر میں اطہر نبی نے کہا کہ اردو اکادمی کی جانب سے جو ڈاکٹر سلیم احمد کو نول کشور ایوارڈ اور ڈاکٹر اکبر علی کو صحافتی ایوارڈ سے نوازا گیا ہے وہ اپنے آپ میں بڑی بات ہے اور یہ بھی بڑی خوشی کی بات ہے کہ ان دونوں ایوارڈ کا انتخاب اکادمی نے ایمانداری کے ساتھ کیا اور سبھی حقدار کو انعام سے نوازہ۔

اس موقع پر اتر پردیش اردو اکادمی کی جانب سے سال ۲۰۲۰ میں صحافتی خدمات کے اعتراف میں جن شخصیات کو اعزاز سے نوازا گیا اس میں ادبی رسالہ سہ ماہی ادبی نشیمن کے مدیر ڈاکٹر سلیم احمد اور روزنامہ آگ کے ایڈیٹر ڈاکٹر اکبر علی بلگرامی کو سپاسنامہ پیش کرتے ہوئے ان کی خدمات کا اعتراف کیا گیا اور انہیں مبارکباد پیش کرتے ہوئے مستقبل میں اسی طرح کی خدمت انجام دینے کی خواہشات اور دعاؤں کا اظہار بھی کیا گیا۔

اس موقع پر جذباتی و انقلابی شاعر نصیر احمد نصیر نے اعزاز کی شان میں بطور خراج تحسین نظم پیش کی اور سینئر صحافی محمد غفران نسیم نے سپاس نامہ پڑھ کر پیش کیا۔صدر اطہر نبی اور مہمان خصوصی کے بدست دونوں شخصیات کو اعزاز اور ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس کے علاوہ زبیر احمد محمد غفران نسیم محمد صفیر صدیقی ،جاوید بیگ ، پرویز احمد، ڈاکٹر عذرا بانو، ڈاکٹر صبغت الزہرا زیدی ،عمران قریشی ،مونی مشرا وغیرہ کو بھی سماجی خدمات کے شعبوں میں کام کرنے کے لئے اعزاز سے نوازا گیا۔تقریب کی نظامت کے فرائض سلام لکھنؤ کے صدر عامر مختار نے انجام دئے جبکہ نصیر احمد نصیر نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

پروفیسر شمیم حنفی کثیر الجہات شخصیت کے مالک تھے: خواجہ اکرام الدین



لکھنؤ۔پروفیسر شمیم حنفی کثیر الجہات شخصیت کے مالک تھے۔انھوں نے ادب و صحافت پر گہرے نقوش قائم کیے۔عصر حاضر کے ممتاز دانشوروں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ان خیالات کا اظہار قومی کونسل کے سابق ڈائریکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے کرامت حسین گرلس مسلم پی جی کالج اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے آل انڈیا کیفی اعظمی اکیڈمی کے سمینار ہال میں پروفیسر شمیم حنفی: شخصیت اور خدمات پر منعقد سمینار میں صدارتی خطاب کے دوران کیا۔ پروگرام میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر انیس اشفاق اور مہمان اعزازی کے طور پر جناب اطہار نبی نے شرکت فرمائی ۔کالج کی پرنسپل محترمہ سحر حسین نے شکریہ ادا کیا۔سمینار کی کوارڈی نیٹر ڈاکٹر نزہت فاطمہ نے مہمانوں اور حاضرین کا خیر مقدم کیا ۔سمینار کی نظامت ڈاکٹر عمیر منظر نے کی ۔ پروگرام کا آغاز کالج کی طالبہ حفصہ یاسمین اور ادیبہ علیم نے قرآن پاک کی تلاوت اور ترجمے سے کیا۔ام ہانی نے کالج کی طرف سے خیر مقدمی نظم پڑھی۔پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے پروفیسر شمیم حنفی کی مختلف النوع خدمات کا ذکر کیا اور کہا کہ وہ ایک ایسے استاد تھے جن کی اپنے طلبہ کے تئیں فکر مندی قابل رشک تھی ۔انھوں نے اپنے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ شمیم حنفی اردو کے ساتھ ساتھ ہندی ادبیات پر گہری نگاہ رکھتے تھے اور دونوں زبانوں کے تاریخی اور تہذیبی روابط پر ان کی گہری نگاہ تھی۔مہمان خصوصی کی حیثیت سے تقریر کرتے ہوئے پروفیسر انیس اشفاق نے کہا کہ ان کی حیثیت ایک دیدہ ور نقاد کی تھی ۔انھوں نے ایک سرگرم زندگی گذاری اور معاصر ادب پر گہرے نقوش قائم کیے ۔مہمان اعزازی جناب اطہر نبی نے کہا کہ شمیم حنفی کی تحریروں کے ساتھ ساتھ ان کی تقریروں اور خطاب کا اپنا الگ لطف ہے حنفی کے اسلوب ،زبان و بیان کا ذکر کیا۔ڈاکٹر گلشن مسرت نے شمیم حنفی کی ڈرامہ نگاری پر مقالہ پڑھتے ہوئے کہا کہ فکری اور فنی اعتبار سے ان کے ڈرامے اہمیت کے حامل ہیں ۔میرا عالیہ نے شمیم حنفی کی شاعری کا مطالعہ پیش کیا اور کہا کہ ان کے اشعار مضمون اور اسلوب دونوں لحاظ متاثر کن ہیں ۔اس کے علاوہ شاہد حبیب فلاحی اور ام ہانی نے بھی مقالہ پڑھا۔آخر میں کالج کی پرنسپل محترمہ سحر حسین نے مہمانوں اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔اور کہا کہ ہم اسے ایک ادبی فریضہ سمجھتے ہیں کیونکہ شمیم حنفی صاحب نے نصف صدی سے زائد عرصہ اردو شعر و ادب کے لیے گذارا اور کئی نسلوں کی تربیت کی۔

۔نئی نسل پر ان کے گہرے اثرات ہیں ۔ ڈاکٹر عمیر منظر نے شمیم حنفی پر خاکہ پڑھتے ہوئے کہا کہ شمیم صاحب اپنی ادبی اور تہذیبی روایت پر گہری نگاہ رکھتے تھے۔معاصر ادب کے رویوں اور رجحانات سے بھی انھیں غیر معمولی شغف تھا۔عمیر منظر کے بقول دلی کی ادبی ،تہذیبی اور معاشرتی تاریخ کو وہ اسی طرح جانتے تھے جیسے اپنے آپ کو۔الہ آباد، اندور ،علی گڑھ اور آخر میں انھوں نے دلی محض ایک شہر یا اپنی زندگی کے اچھے برے دنوں کی یاد کے طور پر دیکھنے کی کبھی سعی نہیں کی بلکہ ان شہروں کو تعلیم و تعلم اور تاریخ و تہذیب کے تناظر میں دیکھا۔ڈاکٹر مجاہد الاسلام نے ان کی تحقیقی تنقید پر مقالہ پڑھتے ہوئے پروفیسر شمیم

Vol: 5, Issue: 02
Mar,April May.2022

Urdu Quarterly
Adabi Nasheman
Lucknow - 226003

RNI No. UPURDU /2017/74845
Per Copy : 25/-
Biannaul Subscription :300/-

دستاویز

ناسخ اوران کے والدین کی قبریں





لکھنؤ کے "فرنگی محل" کا شمار ملک کی مشہور خانقاہوں میں ہوتا ہے۔اس خانقاہ کی نسبت سے آس پاس کے پورے علاقے کو عرصہ سے فرنگی محل کہا جارہا ہے۔فرنگی محل میں واقع "ہرن پارک" کے قرب میں ایک محلہ "ٹکسال" کہلاتا ہے۔اسی ٹکسال میں دبستانِ لکھنؤ کے نمائندہ شاعر "ناسخ" (1772-1838) کا مکان ہوا کرتا تھا۔ وفات کے بعد اسی مکان میں ان کی تدفین ہوئی تھی۔ایک زمانے تک لوگ ان کی قبر پر حاضر ہوتے اور فاتحہ پڑھ کر واپس ہوتے لیکن اب ان کی قبر کا کہیں کوئی اتا پتہ نہیں ہے۔ادبی نشیمن کی ٹیم نے جب وہاں کے بزرگوں سے بات کی تو معلوم ہوا کہ اسی ٹکسال میں ایک مکان ہے جس میں ناسخ کی قبر ہے اور اس کی نشانی بھی بتائی،لیکن ان بزرگوں نے خدشہ ظاہر کیا کہ شاید مکان کے اندر ناسخ کی قبر کے نشان کو بھی اب مٹا دیا گیا ہے۔انھوں نے بتایا کہ کچھ عرصہ پہلے تک ایک بورڈ بھی لگا تھا لیکن اب وہ بھی ہٹا دیا گیا ہے۔ناسخ کی قبر پر قابض مکین اب قبر ہونے سے ہی صاف انکار کرتے ہیں۔اسی علاقے میں ناسخ لین آج بھی موجود ہے۔اس سے تو صاف ظاہر ہو گیا کہ ناسخ کا قیام یہیں تھا اور قبر بھی اسی علاقے میں تھی جس کا وجود اب ختم ہو گیا ہے۔اسی تلاش اور جستجو میں ہم ناسخ کے والدین کی قبر تک ہو نچنے میں کامیاب ہو گئے۔ ناسخ کی والدہ کی قبر تو تھوڑی کوشش کے بعد مل گئی جس پر ایک کتبہ "پیکر اطہر،ام ناسخ" کے نام سے لگا تھا جو بمشکل تمام پڑھنے میں آیا۔یہ قبر انتہائی خستہ حالت میں تھی جبکہ ان کے والد کی قبر کا کہیں پتہ نہیں چل پا رہا تھا۔قبرستان میں کافی تلاش کے بعد ایک جگہ ان کے والد کے نام کی تختی مل گئی۔اب مسئلہ تھا قبر کے پتہ لگانے کا، بلکہ ایک بڑا مشکل کام تھا۔بہر حال قبرستان کی دیکھ بھال کرنے والے کچھ لوگوں سے جب بات چیت کی گئی تو انھوں نے بتایا:"یہ پتھر تو ہم نے ہی یہاں پر رکھا تھا جو کہ اس زمیں بوس قبر پر لگی تھی"۔یہ ہمارے لیے ایک بڑی کامیابی تھی۔ادبی نشیمن کی جانب سے ان دونوں قبروں کو جو کہ ناسخ کے والدین کی تھی،مرمت کرائی گئی اور تاسیسِ نو کی تختی لگا کر ختم ہوتی ہوئی ادبی وراثت کو از سرِ نو قائم کر کے اس کے وجود کو بچانے کی کوشش کی گئی۔تاریخ کے جاننے والے بتاتے ہیں کہ اس قبرستان میں مصحفی (1751-1824) کی بھی قبر تھی جس کا نشان بھی اب مٹ چکا ہے۔

اہلِ علم جانتے ہیں کہ ناسخ کا شوق شاعری اور پہلوانی تھا۔ان کا شمار دبستان لکھنؤ کے بانیان میں ہوتا ہے جس وقت ناسخ نے شاعری کا آغاز کیا اس وقت مصحفی کے شاگرد آتش (1777-1848) بھی لکھنؤ میں موجود تھے اور شعر و ادب کا چراغ جلائے ہوئے تھے۔ان سب کے بیچ میں ناسخ کا امتیاز یہ تھا کہ انھوں نے شاعری کو ایک نئی جہت دی جسے آگے چل کر ان کے شاگردوں نے دبستان کی ہیئت عطا کی۔ناسخ ہی کی بدولت شعر و ادب پر دبستان دہلی کی حکمرانی کے عہد کا خاتمہ ہوا اور دبستان لکھنؤ کی ٹکسال میں رواج پانے والی زبان کو ادب کا سکۂ رائج الوقت مانا گیا۔

Printed,Published & Prop. By **Ahmad Rashiq at Nomani Press, Baroodkhana,Golaganj, Lucknow**
and Published at 544C/168,Almas bagh,Hardoi Road,Lucknow
Editor: Dr. Saleem Ahmad